پاکستان کے تاریخی قلعے

تحریر و ترتیب

محمد انور سندھو

نام کتاب: پاکستان کے تاریخی قلعے

تحریر و تالیف و ترتیب: محمد انور سندھو

سنِ اشاعت: ۲۰۲۵ء

رابطہ / واٹس ایپ: 0092 333 2907799

ای میل: sindhuanwar@hotmail.com

فیس بک: www.facebook.com/MuhammadAnwarSindhu

پیش لفظ

پاکستان کے تاریخی ورثے کو محفوظ کرنے اور عوام میں شعور بیدار کرنے کے لیے محمد انور سندھو کی کتاب "پاکستان کے تاریخی قلعے" ایک قابلِ قدر کاوش ہے۔ یہ کتاب نہ صرف پاکستان کے عظیم الشان قلعوں کی تاریخ کو محفوظ کرنے کے لیے بہترین کاوش ہے بلکہ مصنف نے ان قلعوں کی اہمیت اور موجودہ حالت پر مفصل روشنی ڈالی ہے۔

مصنف ایک ٹیکس کنسلٹنٹ ہیں اور ان کا تعلق صوبہ سندھ سے ہے، سیاحت اور کتاب ان کے شوق ہیں، پاکستان کا ہر علاقہ ان کا دیکھا ہوا ہے۔

یہ کتاب ۲۰۲۵ میں شائع ہوئی اور پاکستان کے مختلف خطوں میں موجود تاریخی قلعوں کی تاریخ، تعمیراتی خصوصیات اور ان کی ثقافتی اہمیت پر مبنی ہے۔ مصنف نے اپنی ۳۲ سالہ سیاحت کے تجربے کی روشنی میں قلعوں کا مشاہدہ کیا اور ۷۰ فیصد قلعے خود دیکھے ہیں جس سے کتاب کی مستندیت میں اضافہ ہوا ہے۔

مصنف نے کتاب کو نہایت آسان اور عام فہم زبان میں تحریر کیا ہے جو سیاحوں کے ساتھ ساتھ ہر طبقے کے قارئین کے لیے قابلِ فہم ہے۔ کتاب میں قلعوں کی تاریخ کے ساتھ ساتھ ان کی موجودہ حالت اور دیکھ بھال کی کمی پر بھی تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے۔ یہ ایک اہم تحقیقی کتاب ہے جو نوجوان نسل کو اپنے تاریخی ورثے کی قدر کرنے کی ترغیب دیتا ہے۔

کتاب میں تاریخی ورثے کی اہمیت پر زور دیا گیا ہے۔ کتاب میں پاکستان کے تاریخی قلعوں کو نہ صرف ایک تعمیراتی ورثہ بلکہ ایک قومی ورثہ بھی قرار دیا گیا ہے۔ یہ قلعے ہماری تاریخ اور ثقافت کی عکاسی کرتے ہیں اور ان کی حفاظت وقت کی اہم ضرورت ہے۔

کتاب میں مختلف قلعوں جیسے لاہور قلعہ، دراوڑ قلعہ، روہتاس قلعہ اور دیگر اہم قلعوں کی تاریخ، تعمیراتی طرز اور ان کے ارد گرد کے علاقے کی اہمیت پر تفصیلی بحث کی گئی ہے۔

مصنف نے اپنی مشاہداتی تحریر کے ساتھ مستند کتب کا حوالہ بھی دیا ہے جس سے کتاب کی تحقیقی اہمیت بڑھ جاتی ہے۔ کتاب میں اس بات پر افسوس کا اظہار کیا گیا ہے کہ تاریخی مقامات کی دیکھ بھال اور ان کی حفاظت پر مناسب توجہ نہیں دی گئی۔

اردو زبان میں قلعوں پر مبنی کتب کی کمی کو مصنف نے خوبصورتی سے پورا کیا ہے۔ لیکن اگر کتاب میں قلعوں کے ساتھ ان کے دور کے سیاسی و سماجی حالات کو بھی شامل کیا جاتا تو مواد مزید جامع ہوتا۔ تاریخی قلعوں کی تصاویر اور ان کے نقشے شامل کیے گئے ہیں جن سے قارئین کو زیادہ بصری مدد ملتی ہے۔

کتاب میں یوٹیوب، انسٹاگرام، اور دیگر ذرائع پر موجود معلومات کی مسخ شدہ حالت کا ذکر ہے لیکن مصنف ان ذرائع کو مثبت طور پر استعمال کرنے کے طریقے بھی بیان کر سکتے تھے۔

"پاکستان کے تاریخی قلعے" ایک اہم کتاب ہے جو پاکستان کے تاریخی ورثے کو محفوظ کرنے اور نئی نسل کو اس کی اہمیت سے آگاہ کرنے کی ایک سنجیدہ کوشش ہے۔ مصنف کی ۳۲ سالہ سیاحتی تحقیق اور مشاہدات کتاب کو ایک منفرد حیثیت دیتے ہیں۔ تاہم کتاب میں چند پہلوؤں پر مزید کام کیا جا سکتا تھا تاکہ یہ مزید جامع اور دلکش بن سکے۔

یہ کتاب پاکستان کے تاریخی ورثے کے تحفظ اور اس کی اہمیت کو اجاگر کرنے میں ایک سنگِ میل ثابت ہو گی۔ نئی نسل کو اپنی تاریخ سے روشناس کرانے کے لیے یہ ایک اہم ذریعہ ہے۔ میں مصنف کو کتاب کی اشاعت پر مبارکباد پیش کرتا ہوں۔

ڈاکٹر عزیز خان چترالی

۸ جنوری ۲۰۲۵

03365114595

عرضِ مرتب

سرزمین پاکستان عظیم تاریخی ورثے کی امین وہ سرزمین ہے کہ جس میں آثار قدیمہ کے ایسے ایسے نادر و اعلیٰ مقامات موجود ہیں جو ہمارے لیے باعث فخر و افتخار ہیں۔ یہ مقامات ایک لحاظ سے سبق آموز بھی ہیں اور دوسرا ان کی روشنی میں ہم ایک بہتر مستقبل بھی متعین کر سکتے ہیں۔

ہمارے ہاں تاریخی ورثے کی افادیت کو وہ اہمیت نہیں دی گئی جس کی اسے ضرورت تھی۔ تاریخی مقامات کی نہ مناسب دیکھ بھال کی گئی اور نہ ہی نوجوان نسل کو اسلاف کے کارناموں سے روشناس کرانے کی سنجیدہ حکمت عملی سے کام لیا گیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ہم اپنی مقامی تاریخ سے تقریباً نابلد ہو چکے ہیں۔

پاکستان کا شمار دنیا کے ان ممالک میں ہوتا ہے جنہیں قدرت نے بیش بہا نعمتوں سے نوازا ہے، وطن عزیز میں جہاں عظیم ترین برفانی چوٹیاں، طویل و عریض اور دنیا کے عظیم ترین گلیشئر، قدرتی چشمے، خوبصورت جھیلیں، بل کھاتے دریا، ریگستان، معدنیات، جنگلات اور ہر طرح کے موسم شامل ہیں، وہاں ملک کے مختلف علاقوں میں زمانہ قدیم میں مختلف حکمرانوں کے ادوار میں تعمیر کئے جانے والے پر شکوہ تاریخی قلعے بھی موجود ہیں، جو کہ نہ صرف ہماری تاریخ بلکہ ثقافت کا بھی ایک اہم حصہ ہیں۔

جب میں نے کتاب لکھنا شروع کی اور مختلف کتابیں تلاش کرنا شروع کیں تو یہ انکشاف ہوا کہ اس موضوع پر اردو میں کوئی بھی کتاب دستیاب نہیں ہے، البتہ یوٹیوب،

ٹک ٹاک اور انسٹا پر مختلف وڈیوز موجود ہیں اور ہر شخص ہر قلعے کے بارے میں مختلف باتیں اور تاریخ بتا رہا ہے صرف اپنی مشہوری کے لیئے تاریخ کو مسخ کیا جا رہا ہے۔

اس کتاب میں جتنے قلعوں کا تعارف اور معلومات دی گئی ہیں ان میں سے ۷۰٪ قلعے میں نے خود وزٹ کیئے ہوئے ہیں اس لیئے کہ (گزشتہ ۳۲ سال سے ہر سال پاکستان ٹور کرتا ہوں) پیارے پاکستان کا ہر شہر اور قصبہ دیکھا ہوا ہے۔ اس کے علاوہ جن کتابوں سے معلومات لیں ہیں ان کے نام آخر میں دے دیے ہیں۔

آخر میں یہ بتانا ضروری سمجھتا ہوں کہ آپ اس کتاب کی پی ڈی ایف بنا کر کسی کو بھی دے سکتے ہیں میری طرف سے کوئی پابندی نہیں ہے۔

محمد انور سندھو

ٹنڈو آدم سندھ

جنوری ۲۰۲۵ء

فہرست

عنوان .... صفحہ نمبر

پیش لفظ.. i

عرضِ مرتب iv

آزاد کشمیر کے قلعے: ۱

تھروچی قلعہ گلپور کوٹلی: ۱

قلعہ باغسر بھمبر:... ۵

رام کوٹ قلعہ : ۹

قلعہ کرجائی: ۱۲

لال قلعہ مظفر آباد:.. ۱۳

گلگت بلتستان کے قلعے: ۱۸

بلتت قلعہ کریم آباد ہنزہ... ۱۸

التت فورٹ ہنزہ:... ۲۶

سکردو: کھرفوچو قلعہ ۲۹

شگر قلعہ، شگر سکردو:.. ۳۴

مسگر قلعہ (قلندرچی فورٹ): ۳۶

خپلو فورٹ (تھوقسی کھر)... ۳۸

پنجاب کے قلعے: ۴۰

فورٹ منرو: ۴۰

اٹک قلعہ: ۴۱

قلعہ روہتاس جہلم: ۴۷

قلعہ دراوڑ چولستان: ۵۶

لاہور قلعہ: ۶۲

قلعہ بَعہد انگریز: ۶۴

مالوٹ قلعہ چکوال: ۷۲

قلعہ پھروالہ: ۷۸

قلعہ شیخوپورہ: ۸۳

قلعہ منکیرہ: ۸۹

قلعہ میر گڑھ فورٹ عباس: ۹۴

قلعہ مروٹ ضلع بہاولنگر: ۹۶

فورٹ عباس: ۹۸

قلعہ غضنفر گڑھ: ۱۰۳

شجاع آباد قلعہ: ۱۱۹

قلعہ نندنہ: ۱۲۱

ستگھرہ قلعہ اوکاڑہ: ۱۲۷

قلعہ روات: ۱۳۲

قلعہ اسلام گڑھ: ۱۳۷

قلعہ بجنوٹ: ۱۴۱

قلعہ دین گڑھ: ۱۴۳

قلعہ موج گڑھ: ۱۴۳

قلعہ خان گڑھ: ۱۴۴

قلعہ نواں کوٹ: ۱۴۵

قلعہ جام گڑھ: ۱۴۵

قلعہ پھولڑا: ۱۴۷

قلعہ مبارک پور: ۱۴۷

قلعہ فتح گڑھ: ۱۴۸

قلعہ ٹبہ جیجل: ۱۴۸

قلعہ خیر گڑھ: ۱۴۹

قلعہ بہاول گڑھ: ۱۴۹

قلعہ سردار گڑھ: ۱۵۰

قلعہ مچھکی: ۱۵۱

قلعہ قائم پور: ۱۵۱

قلعہ مرید والا: ۱۵۱

قلعہ چانڈہ کھانڈہ: ۱۵۲

قلعہ رکن پور: ۱۵۲

قلعہ کنڈیرا: ۱۵۳

قلعہ سیوراہی: ۱۵۳

قلعہ صاحب گڑھ: ۱۵۴

قلعہ ونجھروٹ: ۱۵۴

قلعہ دھویں: ۱۵۵

قلعہ اوچ: ۱۵۵

قلعہ تاج گڑھ: ۱۵۶

قلعہ موء مبارک: ۱۵۶

قلعہ لیارا: ۱۵۷

کسک قلعہ چکوال: ۱۵۷

سنگنی قلعہ: ۱۶۱

منگلا فورٹ: ۱۶۵

قلعہ اکراند: ۱۷۲

قلعہ تلاجہ: ۱۷۴

سندھ کے قلعے: ۱۷۸

کوٹ ڈیجی قلعہ: ۱۷۸

رنی کوٹ قلعہ: ۱۸۴

قلعہ نوکوٹ: ۱۹۰

قلعہ سیہون: ۱۹۵

قاسم فورٹ / منوڑہ فورٹ: ۲۰۱

پکا قلعہ حیدر آباد: ۲۰۲

کچا قلعہ حیدر آباد: ۲۰۹

قلعہ عمر کوٹ: ۲۱۱

فتح آباد قلعہ سکرنڈ: ۲۲۲

خیبر پختونخوا کے قلعے: ۲۲۵

قلعہ بالا حصار: ۲۲۵

قلعہ چترال: ۲۲۸

قلعہ دروش: ۲۳۲

قلعہ مستوج: ۲۳۲

قلعہ چکدرہ: ۲۳۳

ہینڈی سائیڈ فورٹ کوہاٹ: ۲۳۴

قلعہ جمرود: ۲۳۵

قلعہ شاہ گئی: ۲۳۶

قلعہ میران شاہ: ۲۳۷

علی مسجد قلعہ: ۲۳۷

قلعہ ہر کشن گڑھ ہری پور: ۲۳۸

اکال گڑھ قلعہ ڈیرہ اسماعیل خان: ۲۳۸

تھل قلعہ: ۲۴۰

بلوچستان کے قلعے: ۲۴۱

قلعہ ژوب: ۲۴۱

قلعہ میری قلات: ۲۴۴

پنھوں فورٹ: ۲۴۶

سبی قلعہ (سیوی قلعہ): ۲۵۰

مصادر و مراجع ۲۵۵

آزاد کشمیر کے قلعے:

تھروچی قلعہ گلپور کوٹلی:

گلپور، آزاد کشمیر کے ضلع کوٹلی کا ایک قصبہ ہے۔ یہ کوٹلی شہر کے جنوب مغرب میں تقریباً ۱۰ کلو میٹر کے فاصلے پر واقع ہے۔ گلپور کا ایک تاریخی پس منظر ہے، اس کے گاؤں تھروچی میں ایک خوبصورت اور تاریخی قلعہ موجود ہے، جسے 'تھروچی قلعہ کہا جاتا ہے۔ یہ قلعہ، گلپور ہائیڈرو پاور پروجیکٹ کی جگہ سے زیادہ دور نہیں۔ گلپور سے یہ ۲ کلو میٹر کے فاصلے پر ہے اور وہاں تک پہنچنے میں آدھا گھنٹہ لگتا ہے۔

اس قلعے کی تعمیر کے سال کے حوالے سے دو متضاد آراء پائی جاتی ہیں۔ ایک کے مطابق اس قلعے کی تعمیر کشمیر کے آٹھویں سلطان غیاث الدین زین العابدین عرف بڈھ شاہ (بادشاہ) کے وزیر اعظم اور فوج کے سپہ سالار ملک مسعود ٹھاکر نے ۱۴۲۵ء میں کروائی جبکہ دوسری کے مطابق اس کی تعمیر ۱۴۶۰ء میں ہوئی۔ قلعہ تھروچی کو تعمیر کرنے کا بنیادی مقصد غلے کی رسد کو یقینی بنا کر وادی کشمیر میں وقتاً فوقتاً پڑنے والے قحط سے نمٹنا تھا۔

یہ قلعہ کھڑی پہاڑی پر بنایا گیا ہے، جس کی وجہ سے اس تک پہنچنے میں کافی دشواری ہوتی ہے۔ پہلے پہاڑی رستے پر چل کر اُوپر جانا پڑتا ہے اور پھر آخر میں سیڑھیاں آتی ہیں جو قلعے کے مرکزی دروازے تک پہنچاتی ہیں۔ قلعے کا مرکزی دروازہ بھی درست حالت میں ہے۔ نیچے وادی سے قلعہ تھروچی کی اونچائی تقریباً ایک ہزار فٹ اور سطح سمندر سے تقریباً ۳۷۰۰ فٹ ہے۔ اس کو آس پاس کے علاقے میں دشمن پر نظر رکھنے اور اس کے حملوں سے بچنے کے لیے تعمیر کیا گیا۔

قلعے سے دور تک وسیع علاقہ دیکھا جاسکتا ہے۔ پتھر کو تراش کر بنائی جانے والی اینٹوں سے قلعے کی فصیل اور برج کی تعمیر کی گئی، جو باہر کی جانب سے آج بھی کافی بہتر حالت میں دکھائی دیتے ہیں۔ کئی صدیاں گزر جانے کے بعد بھی مضبوطی سے کھڑی قلعے کی ویران فصیل اور برج عظمت رفتہ کی یاد دلاتے ہیں، جہاں کبھی پہرے دار گرد و نواح پر نظر رکھا کرتے تھے۔

فصیل میں کمرے بھی بنے ہوئے ہیں مگر اب وہ کافی خستہ حال ہو چکے ہیں۔ یہاں ایک قید خانہ بھی موجود ہے، جو ابھی تک اپنی اصل حالت میں نظر آتا ہے۔ قلعہ تھروچی کی فصیل میں پہرے داروں کے لیے بڑے بڑے سوراخ بھی بنائے گئے تھے تاکہ وہ چاروں اطراف دشمن پر نظر رکھ سکیں۔ قلعے کی فصیل میں وینٹی لیشن کا نظام بھی دفاعی نقطہ نظر کے تحت بنایا گیا تھا، یعنی درمیان میں تکونی شکل میں پتھر ہے اور اس کے دائیں بائیں لمبائی میں پتلے سوراخ ہیں، تاکہ دشمن کے تیر وہاں سے اندر نہ آسکیں۔

اس کی دیواروں میں چراغ رکھنے کے لیے جگہیں بھی بنائی گئی تھیں۔ قلعے کے احاطے میں مرکز کی جانب ایک چبوترا بنا ہوا ہے، جہاں سے غالباً سپاہ سالار اپنی فوج کی کمان کرتے ہوئے انھیں تیار کرتے اور احکامات دیا کرتے تھے۔ وہ بہت زیادہ جنگی ساز و سامان کے ساتھ قلعے میں رہا کرتے تھے۔ قلعے میں پانی کے لیے ایک باؤلی بھی بنائی گئی تھی جس میں اب کائی والا پانی بھرا رہتا ہے۔

سن ۱۸۰۹ء میں، رنجیت سنگھ نے تھروچی پر حملہ کیا۔ اس حملے میں منگرالوں کو شکست ہوئی اور یوں یہ ان کی حکومت کا آخری دور ثابت ہوا۔ اس کا دفاع کرنے والے

منگرال راجپوت سرداروں میں سردار سمت خان، سردار کرمدی خان ساکن بڑالی، سردار شادمان خان اور سردار ستار محمد خان شامل تھے۔ تاہم، منگرالوں کی حکومت کا سورج غروب ہونے کے بعد سردار ستار محمد خان کے پڑپوتے کرنل محمود خان نے ۱۱اے کے بٹالین کی کمان کرتے ہوئے ۱۹۴۸ء میں اسے ڈوگرا فوج سے واگزار کرایا۔

سن ۱۹۴۷ء میں تقسیمِ ہند کے بعد کرنل محمود خان منگرال کی سربراہی میں مقامی لوگوں کے ایک دستے نے ڈوگرا افواج کو شکست دی اور ان کا پیچھا کیا۔ ڈوگرا سپاہیوں کا جب تھروچی قلعے میں محاصرہ کیا گیا تو انھوں نے جموں کی طرف بھاگنے کا فیصلہ کیا۔ قلعہ تھروچی کے مغرب میں دریائے پونچھ کی جانب گھاٹی بنی ہوئی ہے۔ وہاں سے ڈوگرا فوجی نیچے رسیاں ڈال کر اترے، پھر چانگ پور اور خاس گاؤں کے رستے نکلنا شروع کیا اور کچھ نے توماحولی دریا کا راستہ بھی اختیار کیا۔

تاہم، منگرال کے دستے نے ڈوگرا افواج کا تعاقب کرتے ہوئے جونا کے قریب ڈبریا کے مقام پر انھیں پکڑ لیا، جہاں ان کے درمیان مقابلہ ہوا جس میں ڈوگرا فوج کے کئی فوجی مارے گئے جبکہ کچھ افراد جو بھاری ہتھیاروں سے لیس تھے جموں کی طرف پیچھے ہٹنے میں کامیاب ہوئے۔ یوں منگرالوں کی شان رفتہ کا منہ بولتا ثبوت قلعہ تھروچی ایک بار پھر ان کے پاس آ گیا۔

پتھر کی اینٹوں سے تعمیر شدہ قلعہ تھروچی اپنی مضبوطی کے باعث کئی صدیاں گزر جانے کے باوجود آج بھی اپنی جگہ ایستادہ ہے۔ تاہم، مناسب دیکھ بھال نہ ہونے کی وجہ سے یہ قلعہ آزاد کشمیر کے دیگر قلعوں کی طرح زبوں حالی کا شکار ہے۔

بالخصوص اندرونی حصہ کافی زیادہ مٹی کی نذر ہو چکا ہے۔ زلزلوں اور دیگر قدرتی آفات نے بھی اسے نقصان پہنچایا ہے، جس کی وجہ سے اس کی دیواریں کہیں کہیں سے منہدم ہو گئی ہیں۔ اس طرح کے تاریخی مقامات کی از سرِ نو بحالی سے سیاحت کو فروغ دیا جاسکتا ہے۔

قلعہ باغسر بھمبر:

بھمبر آزاد کشمیر کا تاریخی مقام ہے۔ یوں ریاست جموں و کشمیر کا ہر شہر اپنی تاریخی اہمیت رکھتا ہے۔ لیکن بھمبر کی تاریخی اہمیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کے مغل حکمران یہاں سے گزر کر سرینگر جایا کرتے تھے۔ اسے بابِ کشمیر بھی کہا جاتا ہے۔ کسی دور میں بھمبر ایک ریاست کے طور پر بھی جانا جاتا تھا۔ موجودہ بھمبر کو آزاد کشمیر کے ایک ضلع کی حیثیت حاصل ہے۔ یہ ضلع تین تحصیلوں پر مشتمل ہے، تحصیل بھمبر، تحصیل سماہنی، تحصیل برنالہ۔ ضلع بھمبر میں ماضی کی بہت ساری یادگاریں موجود ہیں۔ ایسی ہی تاریخی جھیل اور باغسر قلعہ ضلع بھمبر کی تحصیل کے گاؤں باغسر میں واقع ہے

دنیا کی نظروں سے اوجھل قدیم قلعوں میں سے ایک تاریخی باغ سر قلعہ بھی ہے، جسے بھمبر کے قریب وادی سماہنی کے مشرق میں تعمیر کیا گیا۔ کچھ تاریخی عمارتیں ایسی

ہیں جن کے سن تعمیر کے بارے میں حتمی طور پر نہیں بتایا جاسکتا کہ انہیں کب اور کس نے تعمیر کروایا، قلعہ باغ سر کا شمار بھی انہی میں ہوتا ہے جس کے سن تعمیر کے بارے میں درست معلومات دستیاب نہیں ہیں۔

کچھ کا ماننا ہے کہ یہ قلعہ مغلیہ دور میں تعمیر کیا گیا جبکہ کچھ کا کہنا ہے کہ اس کی تعمیر ڈوگرہ دورِ حکومت کے دوران عمل میں آئی۔ قلعے کی بیرونی دیواریں مغل طرزِ تعمیر کی لگتی ہیں لیکن اس کا اندرونی طرزِ تعمیر مغل دور کا نہیں لگتا، قلعے میں بنے نقش و نگار ہندوانہ اندازِ تعمیر کی عکاسی کرتے ہیں۔ قلعے کی شمالی فصیل میں بنے نقش و نگار ہندو طرزِ تعمیر کا پتہ دیتے ہیں۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ قلعہ باغ سر رنجیت سنگھ کے وزیر اعظم دھیان سنگھ نے تعمیر کروایا تھا۔

یہ وہی دھیان سنگھ ہے جس کا بھائی گلاب سنگھ بعد میں ڈوگرہ حکمران بنا تھا۔ اس بنا پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ قلعہ باغ سر ڈوگرہ دورِ حکومت میں تعمیر کیا گیا تھا۔ اس قلعے نے احمد شاہ ابدالی، رنجیت سنگھ اور گلاب سنگھ کے دور حکومت میں اہم کردار ادا کیا۔

قلعے کی بیرونی فصیل اور مینار مغلیہ طرز کے ہیں جب کہ قلعے کا اندرون اس بات کی گواہی دیتا ہے کہ اسے سکھ دور میں تعمیر کیا گیا۔ غالب امکان یہی ہے کہ سکھوں اور مغلوں دونوں نے اس قلعے کو تعمیر بھی کیا اور استعمال بھی کیا۔

تین دروازوں، ۲۸ بیرونی کمروں اور ۴۲ اندورنی کمروں کے ساتھ یہ قلعہ آج بھی اپنی اصلی حالت میں قائم ہے۔ قلعے کا داخلی دروازہ مقبوضہ جموں کی طرف ہے، اس لیے بار بار کی گولہ باری سے یہ تباہ ہو چکا ہے۔ قلعہ باغ سر عین لائن آف کنٹرول پر واقع

ہے۔ قلعے کی فصیل پر کھڑے ہو کر آپ دوسری طرف کے کشمیر کو بہ آسانی دیکھ سکتے ہیں۔ باغسر کے متعلق واضح مصدقہ ریکارڈ موجود نہیں۔ عموماً باغسر قلعہ کو مغلوں سے منسوب کیا جاتا ہے۔ مگر غیر جانبدار مصنفین میں سے کسی ایک نے بھی اس قلعہ کو اپنی تحریروں اور سفر ناموں میں مغلوں سے منسوب نہیں کیا۔ جی ٹی وینگ ایک یورپی مورخ اپنے سفر نامے ٹریول ان کشمیر، لداخ اینڈ سکردو میں صفحہ ۲۳۸ جلد اول میں لکھتے ہیں کہ یہ قلعہ مہاراجہ رنجیت سنگھ کے وزیر اور ڈوگرہ حکمران گلاب سنگھ کے بھائی دھیان سنگھ نے تعمیر کروایا تھا

مشہور فرانسیسی مورخ برنئیر پہلا یورپی مورخ تھس جو ۱۶۶۵ء میں کشمیر آیا۔ اس نے شاہراہ نمک سے مغل بادشاہ اورنگزیب کے ساتھ سفر کیا، اس نے اس شاہراہ پر واقع ہر تاریخی عمارت کا ذکر کیا، مگر باغسر قلعہ کا ذکر نہیں کیا۔ اگر یہ قلعہ اس وقت موجود ہوتا تو وہ ضرور زکر کرتا۔ اس کے علاوہ مور کرافٹ نے بھی اپنے سفر نامے میں (۱۸۲۵، ۱۸۱۹) میں اس قلعہ کا ذکر نہیں کیا۔

قلعہ کے باہر ایک قبر بھی موجود ہے جس کے متعلق یہ کہا جاتا ہے کہ یہاں بادشاہ جہانگیر کی آنتڑیاں دفن ہیں، لیکن مورخین جہانگیر کی جائے وفات راجوری لکھتے ہیں۔ اور وہیں پر اس کی آنتڑیوں کی تدفین کا ذکر بھی کرتے ہیں۔ ثریا خورشید نے اپنے سفر نامے "بانہال" میں لکھا کے جہانگیر کی موت راجوری کے قریب ہوئی، اور اس کی آنتڑیاں بھی وہیں پر دفن ہیں۔ مزار بھی ہے

رام کوٹ قلعہ:

سولہویں اور سترہویں صدی میں کشمیر کے مسلمان حکمرانوں نے کئی قلعے تعمیر کروائے، جن میں سے ایک رامکوٹ قلعہ بھی ہے، جو اب منگلا جھیل سے گھرا ہوا ہے۔ یہ قلعہ جہلم اور پونچھ دریاؤں کے سنگم پر ایک اونچی پہاڑی پر قائم ہے، جہاں سے چمکدار نیلے پانیوں کا نظارہ بہت دیدہ زیب لگتا ہے۔ اپنے غیر معمولی طور پر منفرد طرزِ تعمیر کی بناء پر رام کوٹ قلعہ کشمیر میں تعمیر کیے گئے باقی قلعوں سے کافی مختلف ہے۔ منگلا اور مظفر آباد قلعوں سے ملتے جلتے طرزِ تعمیر والا یہ قلعہ شاید اسی دور میں تعمیر کیا گیا تھا۔ قلعے تک پہنچنے کے لیے آپ کو منگلا ڈیم پر واٹر اسپورٹس کلب سے ایک کشتی میں بیٹھنا ہوگا، اور تقریباً ۱۰ منٹ کے سفر کے بعد آپ جھیل کے شمالی حصے میں پہنچ جائیں گے۔ یہاں آپ کو ایک پہاڑی کی چوٹی پر ایک عظیم الشان قلعہ دکھائی دے گا۔ تھوڑی، لیکن کھڑی چڑھائی کے بعد آپ قلعے تک پہنچ جاتے ہیں۔ ماضی میں اس کا یہ پیچیدہ محلِ وقوع اس کے لیے کافی فائدہ مند رہا ہوگا، لیکن آج کل یہی محلِ وقوع اس کی علیحدگی اور تنہائی کی وجہ بن گیا ہے۔ شاید اس کی دوری اور مشکل خطے کی وجہ سے منگلا جھیل کے دوسرے حصوں کی بہ نسبت کم ہی لوگ یہاں آتے ہیں، آزاد جموں و کشمیر حکومت، اور نہ ہی وفاقی حکومت (جو منگلا ڈیم کا انتظام سنبھالتی ہے) اس ورثے کی بحالی اور دیکھ بھال میں کوئی دلچسپی رکھتی ہے۔ ویسے تو قلعے کا زیادہ تر حصہ کھنڈرات میں تبدیل ہو گیا ہے، لیکن ماضی کی شان و شوکت کی چند علامات اب بھی باقی ہیں۔ مثال کے طور پر مرکزی راستہ، جسے بہترین حکمتِ عملی کے تحت ہر زاویے پر فائرنگ کے لیے چوکیوں کے ساتھ بنایا گیا ہے۔ یہ قلعہ بند حصے میں جانے اور باہر آنے کا

واحد راستہ ہے۔ فصیلوں کے ساتھ ڈھلوانیں بنائی گئی ہیں، جو یقیناً توپوں کو پوزیشن میں لانے کے لیے استعمال ہوا کرتی ہوں گی۔

پانی کے تالابوں کے بارے میں مؤرخین یہ اندازہ لگانے میں ناکام ہیں کہ آخر اس نسبتاً چھوٹے قلعے میں اتنے بڑے تالاب کیوں بنائے گئے ہیں۔

دیگر کئی تاریخی ورثوں کی طرح رامکوٹ کی تعمیر کے حوالے سے بھی کئی کہانیاں موجود ہیں۔ کہتے ہیں کہ یہ قلعہ ایک قدیم ہندو شیو مندر پر تعمیر کیا گیا تھا، لیکن اس کی

موجودہ حالت کو دیکھتے ہوئے اس بات میں شک کرنا مشکل ہے کہ یہ سولہویں صدی کی تعمیر ہے۔

ماہرِ آثارِ قدیمہ ڈاکٹر سیف الرحمان ڈار کے مطابق یہ قلعہ کیونکہ مظفر آباد قلعے جیسا ہی ہے، اس لیے اس بات کا کافی امکان موجود ہے کہ یہ سولہویں صدی کے پہلے نصف میں تعمیر کیا گیا ہو گا، جبکہ فصیلوں کے ساتھ ڈھلوانیں، توپوں کے لیے کنگرے، اور بندوقچیوں کے لیے تنگ سوراخ تب بنائے گئے جب یہ قلعہ انیسویں صدی میں کشمیر کے ڈوگرا مہاراجہ کے زیرِ تسلط تھا۔

آزاد کشمیر کے دیگر قلعوں (جیسے منگلا، مظفر آباد، بڑجن، اور تھروچھی) کی طرح رام کوٹ قلعہ تاریخی ریکارڈز میں اپنی جگہ نہیں بنا سکتا۔ کشمیر کے ۱۸۴۱ کے ایرو اسمتھ نقشے میں اس کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ لیکن مشہور سفری مصنف سلمان رشید کے مطابق مہاراجہ کشمیر کے مقرر کردہ ماہرِ ارضیات فریڈریک ڈریو ۱۸۷۵ میں شائع ہونے والی اپنی کتاب The Jummoo and Kashmir Territories: A Geographical Account میں رامکوٹ قلعہ پر روشنی ڈالتے ہیں۔ ڈریو کے مطابق توگلو نامی ایک گکھر نے یہ قلعہ تعمیر کروایا تھا، جبکہ گکھروں کے بعد یہ ڈوگروں کے زیرِ تسلط چلا گیا۔

قلعہ کرجائی:

مخدوش ہوتا یہ معروف قلعہ کھوئی رٹہ شہر سے تقریباً ۱۷ کلومیٹر کے فاصلے پر وادی بناہ میں واقع ہے۔ اسے ایک اونچے ٹیلے پر تقریباً ۳۵۰سال قبل تعمیر کیا گیا تھا۔ قلعے کے حوالے سے درست تاریخ تو کسی کو معلوم نہیں مگر کہا جاتا ہے کہ یہ قلعہ مغل بادشاہ اکبر نے تعمیر کروایا جبکہ کچھ کا کہنا ہے کہ اس کی تعمیر گورنر کشمیر ملک ظفر نے کروائی اور یہ گرمیوں میں اس کی بیٹی راج محل بیگم کی آرام گاہ تھا۔ قلعے کی تعمیر میں پتھروں اور چونے کا استعمال کیا گیا۔

اس کے چاروں اطراف مضبوط اور بلند فصیل جبکہ دور سے آنے والے حملہ آوروں پر نظر رکھنے کے لیے پہرہ داروں کی چوکیاں بنائی گئی تھیں۔ یہ سطح سمندر سے ۲۵۰۰ فٹ کی بلندی پر ہے۔ قلعے میں کھڑے ہو کر ایسا لگتا ہے جیسے آپ بلند ترین مقام پر کھڑے ہوں ، بادل آپ کے پاس سے گزرتے ہیں، اچانک دھوپ نکل آتی ہے اور اگلے ہی لمحے بادل۔ یہاں سے بہت ہی دلکش نظارے دیکھنے کو ملتے ہیں۔

تقسیم ہند سے قبل قلعے سے ایک راستہ مقبوضہ جموں کشمیر کے علاقے راجوری کو بھی جاتا تھا۔ طویل عرصے سے حکومتوں کی عدم توجہ کے باعث یہ قلعہ اب کھنڈر کا منظر پیش کرتا ہے اور وقت کے ساتھ ساتھ اپنا وجود کھوتا جا رہا ہے۔

لال قلعہ مظفر آباد:

اسے مظفر آباد قلعہ اور رتہ قلعہ بھی کہا جاتا ہے۔ مظفر آباد میں دریائے نیلم (کشن گنگا) کے کنارے کشمیر کے چک حکمرانوں نے ۱۵۴۹ء میں اس قلعے کی بنیاد رکھی۔ مغل اور چک حکمرانوں کے مابین ریاست کشمیر کی سرحدوں پر فوجی شورشیں معمول کی بات تھی۔

اس کی نزاکت کو سمجھتے ہوئے چک حکمرانوں نے سرحدوں اور عوام کی حفاظت کی غرض سے دفاعی حصار کی تعمیر کا فیصلہ کیا تاکہ حملہ آوروں سے شہر کو محفوظ رکھا جا سکے۔ تینوں اطراف سے دریائے کشن گنگا (نیلم) کی قدرتی حدود اور ایک جانب سے خشکی کا راستہ ہونے کی بناء پر سولہویں صدی میں اس جگہ کو قلعے کی تعمیر کے لیے موزوں ترین قرار دیا گیا اور اس کی موزونیت بعد از تکمیل شہر پر ہونے والے حملوں کے جواب میں دفاع کی صورت میں درست ثابت بھی ہوئی۔ اس کا تین اطراف سے دریائے کشن گنگا (نیلم) میں گھرا ہونا دفاعی لحاظ سے انتہائی کارآمد رہا۔

سولہویں صدی میں تعمیر ہونے والا مظفر آباد کا تاریخی لال قلعہ برصغیر کے مختلف حکمرانوں کے عروج و زوال دیکھنے کے بعد آج بھی شان و شوکت سے ایستادہ ہے۔ اس کی تعمیر چک دور کے کاریگروں کا عظیم شاہکار اور ہنر مندوں کی مہارت کی عکاس ہے۔ تعمیر کے وقت لال قلعے کا رقبہ ۵۹ کنال تھا اور اس کی تعمیر میں دریا کا گول پتھر استعمال کیا گیا۔ چک دور کے بعد جب ۱۵۸۷ء میں مغل حکمرانوں نے ریاست کشمیر کی باگ ڈور سنبھالی تو لال قلعے کی دفاعی حیثیت قدرے کم ہو گئی۔

اس کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ مغل حکمرانوں کی توجہ اُس وقت کابل، بخارا اور بدخشاں کی جانب تھی۔ لہٰذا اس قلعے کو شاہی رہائش گاہ کی حیثیت دے دی گئی اور مغلوں کے دورہ کشمیر کے دوران اس قلعے کو پڑاؤ کے طور پر بھی استعمال کیا جانے لگا۔ تاہم، درانی عہد میں لال قلعے کی دفاعی اہمیت پھر سے دوچند ہو گئی اور اس دور میں قلعے کی توسیع اور مضبوطی کا کام کیا گیا جبکہ سلطان مظفر خان (جن کے نام پر مظفر آباد شہر ہے) نے ۱۶۴۶ء میں بالآخر اس کی توسیع مکمل کی۔

ڈوگرہ دور میں مہاراجہ گلاب سنگھ اور مہاراجہ رنبیر سنگھ نے بھی مظفر آباد کی سیاسی و عسکری اہمیت کو سمجھتے ہوئے اپنے ادوار میں قلعے کی از سرِ نو تعمیر کی۔ بتایا جاتا ہے کہ ۱۹۲۸ء میں ڈوگرہ حکمران اس قلعے کو چھوڑ گئے تھے۔ اس کے بعد کافی عرصے تک لال قلعہ بند پڑا رہا اور پھر اسے محکمہ سیاحت و آثار قدیمہ آزاد جموں و کشمیر کے حوالے کر دیا گیا۔ محکمے نے اس کی بحالی کا کام کیا اور پھر اسے عوام کے لیے کھول دیا۔ ۱۹۹۲ء میں آنے والے سیلاب اور ۲۰۰۵ء کے زلزلے میں اس قلعے کو کافی نقصان پہنچا اور اس کا بہت بڑا حصہ منہدم ہو گیا۔ اس کے بچ جانے والے حصے میں تین بڑے صحن ہیں۔ تاہم، قلعے کے بیشتر کمرے دریا برد ہو چکے ہیں جبکہ باقی رہ جانے والے کمروں کی محض ایک یا دو دیواریں ہی باقی رہ گئی ہیں۔ اس میں فوجیوں کے لیے بیرکس بھی بنائی گئی تھیں۔ قلعے کے شمالی حصے میں ٹیرس بنائے گئے تھے جہاں سے سیڑھیاں نیچے موجود دریا کنارے جاتی تھیں۔ تاہم، قلعے کے شمالی حصے کا زیادہ تر حصہ دریا کی تند و تیز لہروں کی نذر ہو چکا ہے۔ اس کے مشرقی حصے کو سیلاب کے خطرات سے محفوظ بنانے کے لیے کافی اقدامات کیے گئے تھے۔

قلعے میں آٹھ کمروں پر مشتمل قید خانے ہیں جو متعدد کال کوٹھڑیوں پر مشتمل ہیں، ان کی چھتیں اینٹوں سے بنی ہوئی ہیں۔ شمالی حصے میں کئی زیرِ زمین کمرے ایسے تھے جن کے بارے میں صرف چند مقامی لوگ ہی جانتے تھے۔ قلعے میں جا بجا سیاحوں کے بیٹھنے کا انتظام کیا گیا ہے۔ سیاحوں سے زیادہ مقامی لوگ لال قلعے کا رُخ کرتے ہیں۔

لال قلعے کے باہر ایک سرائے بھی ہوا کرتی تھی، ۲۰۰۵ء کے زلزلے میں تباہ ہونے کے بعد اسے دوبارہ تعمیر نہیں کیا گیا۔ قلعے میں موجود عجائب گھر بھی ۲۰۰۵ء کے زلزلے سے متاثر ہوا، یہاں موجود بعض نوادرات چوری کر لیے گئے جبکہ بچ جانے والی نادر

اشیا ایک کمرے میں بند کر دی گئیں۔ ۲۰۱۰ء کے سیلاب میں دریائے نیلم کا بہاؤ لال قلعے کی جانب ہونے کے بعد اس کے بچاؤ کے لیے ایک حفاظتی دیوار تعمیر کی گئی۔

یہ ۴۵۰ سالہ تاریخ کا حامل مظفر آباد کا لال قلعہ موسمی تغیرات، سیلابوں، زلزلوں اور حکومت کی عدم توجہی کے باوجود آج بھی اپنا وجود برقرار رکھے ہوئے ہے۔

گلگت بلتستان کے قلعے:

بلتت قلعہ کریم آباد ہنزہ

وادی ہنزہ کی تاریخ صدیوں پرانی ہے، یہی وجہ ہے کہ یہاں زمانہ قدیم کے قلعے آج بھی دیکھنے کو ملتے ہیں۔ یہ قلعے تاریخی شاہراہ ریشم کے اس دور کی گواہی دیتے ہیں جب چین سے لے کر شمالی ہندوستان اور یورپ تک اس سے منسلک تھے

سات سو پچاس سال پرانا پر شکوہ قلعہ بلتت آج بھی پوری شان و شوکت سے اپنا وجود قائم کیے دکھائی دیتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ہنزہ کے شاہی خاندان کے دو بھائیوں پرنس شاہ عباس عرف شابوس اور پرنس علی خان کے درمیان پیدا ہونے والے تنازع کے نتیجے میں ”قلعہ بلتت“ کی تعمیر عمل میں آئی۔

ایک رائے یہ بھی ہے کہ جب ہنزہ کے حکمران ایاشو خاندان کے چوتھے ولی عہد شہزادہ ایاشو ثانی کی شادی بلتستان کے حکمران راجہ ابدال کی بیٹی شاہ خاتون سے ہوئی تو شہزادی کی رہائش کے لیے اسی قلعے کا انتخاب ہوا۔ ادشاہ راجہ ابدال نے اپنی بیٹی کی شادی کے بعد اپنی سلطنت سے ماہر گاریگروں کی ایک ٹیم جہیز کے ساتھ وادی ہنزہ روانہ کی جنھوں نے قلعہ بلتت کی تعمیر یا توسیع میں حصہ لیا۔

قلعہ بلتت کی تعمیر کے حوالے سے کئی داستانیں سینہ بہ سینہ صدیوں سے چلی آ رہی ہیں اور آج بھی اس قلعے تک آنے والے سیاحوں کو یہاں کے مقامی لوگ یہی قصے سناتے ہیں۔

قلعہ بلتت، کریم آباد میں واقع ہے جو کبھی ریاست ہنزہ کا دارالحکومت ہوا کرتا تھا۔ ۱۹۴۵ء تک یہ قلعہ ہنزہ کے امیر کے زیر استعمال رہا لیکن بعد میں انھوں نے کریم آباد میں گرینائیٹ پتھر سے بنے خوبصورت محل میں رہائش اختیار کرلی تو یہ خالی ہو گیا۔ ۱۹۹۰ء میں ہنزہ کے آخری حکمران کے بیٹے نے قلعے کو باقاعدہ طور پر بلتت ہیریٹیج ٹرسٹ کے حوالے کر دیا، جس کے بعد اس کی بحالی کا کام شروع ہوا جو ۶ کروڑ روپے کی لاگت سے ۱۹۹۶ء میں مکمل ہوا۔

ایک اونچی پتھر کی چوٹی پر واقع اس قلعے کی بناوٹ تبت طرز تعمیر سے مشابہت رکھتی ہے، وہاں کے شہر لاسا میں اس سے تشابہ پوٹالہ پیلس موجود ہے۔ مقامی تاریخ دانوں کے مطابق ہنزہ کے حکمران نے بلتستان کی شہزادی سے شادی کی تھی اور جہیز کے طور پر آنے والے کاریگروں نے قلعہ بلتت کی تعمیر نو کی تھی۔ پتھروں سے بنا یہ خوبصورت قلعہ کسی ایک دور میں مکمل تعمیر نہیں ہوا بلکہ ہنزہ کے مختلف حکمرانوں نے اپنے اپنے وقت میں بہت سے توسیعی کام کروائے جبکہ آخری بڑی تبدیلی انگریزوں کے دور میں دیکھنے میں آئی۔

تین منزلوں پر مشتمل قلعہ بلتت مستطیل شکل کا بنا ہوا ہے۔ نچلی منزل بنیادی طور پر اسٹوریج چیمبروں پر مشتمل ہے جبکہ پہلی منزل چاروں اطراف سے کھلے ہال کی طرح بنی ہوئی ہے۔ دوسری منزل زیادہ تر سردیوں کے مہینوں میں استعمال ہوتی ہے، یہاں آڈیئنس ہال، گیسٹ روم، ڈائننگ ہال، باورچی خانہ اور سرونٹ کوارٹرز بنے ہوئے ہیں۔ تیسری منزل پر گرمیوں میں استعمال کے لیے ڈائننگ روم، آڈیئنس چیمبر، بیڈروم اور استقبالیہ ہال بنایا گیا ہے۔ ۱۹۹۰ء میں ہونے والے بحالی کے کام سے اس بات کی طرف

اشارہ ملا کہ قلعہ کا بنیادی ڈھانچہ، ایک دفاعی لکڑی اور پتھر والا مینار آٹھویں صدی میں تعمیر کیے گئے تھے۔

یہ مینار اور بعد میں بنائے گئے دیگر اضافی مینار ایک ہی منزل کی تعمیر سے منسلک تھے، جو کہ چھوٹے کمروں اور ذیلی سطح کے اسٹور تیج چیمبرز پر مشتمل تھی۔ بعد میں قلعے کی توسیع کر کے دوسری اور تیسری منزلوں کا اضافہ کیا گیا۔ چونکہ قلعہ بلتت ایک ایسے علاقے میں تعمیر کیا گیا جہاں زلزلوں کی کثرت کی وجہ سے زمین حرکت کرتی ہے، لہٰذا اس کے بنیادی ڈھانچے میں تعمیر کی گئیں پتھر کی دیواروں کو مزید استحکام دینے کے لیے اسے لکڑی کا روایتی اندرونی فریم ورک فراہم کیا گیا ہے۔

قلعہ بلتت کی تعمیر میں لکڑی کا بہترین کام کیا گیا ہے جو کہ ماہر کاریگروں کی صناعی کا بہترین نمونہ ہے۔ قلعے میں لکڑی کی بڑی بڑی کھڑکیاں، دریچے، برآمدوں کے ستون اور گیلریاں بنائی گئی ہیں، جن پر ابھرے ہوئے لکڑی کے نقش و نگار حکمرانوں کے ذوق اور معماروں کے فن کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔ کئی جنگوں کے بعد بھی اپنا وجود برقرار رکھنے والے قلعہ بلتت میں ہنزہ کے میروں نے ۶۲ دروازے بنوائے۔ قلعے کے اندر داخل ہوتے ہی گویا معلوم ہوتا ہے کہ سات صدی پرانے دور میں پہنچ گئے ہوں۔ قلعے میں ۵۳ کمرے ہیں، ایک کمرے سے وادی ہنزہ کے دلکش مناظر دیکھنے کو ملتے ہیں جبکہ سامنے ہی دنیا کی بلند ترین چوٹیوں میں سے ایک ‘راکاپوشی’ نظر آتی ہے۔

جب ۱۴ویں کی رات راکاپوشی کی برف پوش چوٹیاں اور پہاڑی وادیاں چمکتی ہیں تو ایک عجیب سحر انگیز سماں بندھ جاتا ہے اور یہ منظر ملکی و غیر ملکی سیاحوں کے لیے قابل دید

ہوتا ہے۔ ایک اور کمرے میں دیوار پر مقامی طور پر تیار کردہ قالین لٹکا ہوا ہے۔ قلعے میں پرانے زمانے کی ایک بندوق بھی موجود ہے، جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ ۱۸ ویں صدی میں ایک روسی جاسوس نے اس وقت کے حکمران کو بطور تحفہ دی تھی۔

ہنزہ کے میر اور رانی کے شاہی لباس اور قدیم زمانے کے موسیقی کے آلات آج بھی قلعے میں محفوظ ہیں۔ موسیقی کے یہ آلات تاحال کارآمد ہیں، جن کا استعمال ہنزہ میں شادی یا کسی خوشی کے موقع پر کیا جاتا ہے۔ قلعے کے باورچی خانے میں پرانے وقتوں کے لوہے اور پتھر کے برتن رکھے ہوئے ہیں۔ یہاں ایک تہہ خانے میں جیل بھی بنی ہوئی ہے جبکہ چھت پر پرانے زمانے کی ایک توپ موجود ہے۔ قلعے میں حکمرانوں کے دربار لگانے کی جگہ اب تک ویسی ہی ہے مگر وہاں سیاحوں کو بیٹھنے کی اجازت نہیں دی جاتی۔ چین نے شاہراہ قراقرم کو وادی ہنزہ سے گزارنے کے لیے ہنزہ کے حکمران سے ایک معاہدہ کیا تھا، قلعے میں اس کی تعمیر کے حوالے سے تاریخی دستاویز بھی موجود ہے۔

بلتت فورٹ جتنا مشہور وہاں کا سیکیورٹی انچارج جو اپنی منفرد مونچھوں کی وجہ سے دنیا میں جانا جاتا ہے۔

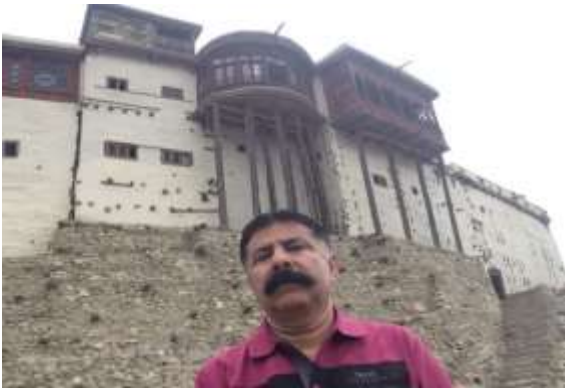

یہ بات صاف ظاہر ہے کہ تین منزلوں پر مشتمل یہ قلعہ ایک ساتھ نہیں تعمیر ہوا تھا اور اس میں وقت کے ساتھ ساتھ اضافہ کیا گیا۔ کہا جاتا ہے کہ تعمیر کے وقت اس کی صرف ایک منزل تھی۔ رانی عتیقہ غضنفر بھی اس بات سے متفق ہیں۔

اس قلعے میں کُل ۶۲ دروازے اور ۵۳ کمرے ہیں۔ اس قلعے کی تعمیر میں پتھر کے علاوہ دیواروں کو مزید مضبوط بنانے کے لیے قیمتیی لکڑی کا روایتی کام کیا گیا ہے۔ بڑی بڑی کھڑکیاں، دریچے، برآمدوں کے ستون اور گیلریاں جن پر ابھرے ہوئے لکڑی کے نقش و نگار معماروں کے فن کا کمال نمونہ پیش کرتی ہیں۔ پہلی منزل چاروں اطراف سے کھلی ہے جبکہ دوسری منزل میں مہمان خانہ اور شاہی دربار موجود ہیں جہاں ہنزہ کے حکمران کئی سالوں تک امور مملکت انجام دیتے رہے۔ یہاں وہ مقام اب بھی محفوظ رکھا گیا ہے جہاں حکمران دربار لگاتے تھے

تیسری منزل کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہاں پر ہنزہ کے حکمرانوں کی رہائش گاہیں تھیں۔ میر آف ہنزہ کے کمرے میں ایک تنور نما گڑھا پایا جاتا ہے جہاں بادشاہ کی شراب تھنّی رکھی جاتی تھی۔

عام فریادیوں سے ملاقات والے مقام پر نیچے کی جانب ایک سوراخ آج بھی موجود ہے۔ بتایا جاتا ہے کہ جب کوئی شہری بادشاہ کے پاس فریاد لے کر آتا تو وہ پہلے نذرانہ پیش کرتا جو کہ اس سوراخ میں ڈالا جاتا۔ یہ عموماً گندم، جو، خوبانی یا دیگر اجناس کی شکل میں ہوتا تھا۔

نچلی منزل بنیادی طور پر گوداموں اور ایسے کمروں پر مشتمل ہیں جہاں پر کھانے پینے کی اشیا ذخیرہ کی جاتی تھیں۔

ہنزہ کے حکمران اور رانی کے شاہی لباس بھی موجود ہیں تاہم یہ نہیں بتایا گیا کہ یہ کون سے دور میں استعمال ہوتے تھے۔ دیوار پر مقامی طور پر تیار کردہ قالین بھی موجود ہے۔ روایات کے مطابق تہہ خانے کو جیل کے طور پر استعمال کیا جاتا تھا جہاں پر مجرموں کو سزائیں بھی دی جاتی تھیں۔

ہنزہ کی مقامی اور روایتی موسیقی کے علاوہ مقامی کھانے آج بھی سیاحوں کو اپنی طرف کھینچ لیتے ہیں۔ قلعے میں پرانے زمانے کے موسیقی کے آلات بھی محفوظ ہیں۔ مقامی طور پر ہنزہ میں اب بھی شادی یا خوشی کے موقع پر موسیقی کے ایسے ہی آلات کا استعمال کیا جاتا ہے جو قلعہ میں دکھائی دیتے ہیں۔

قلعے کے باورچی خانہ میں لوہے سے تیار کردہ کھانا پکانے کے برتن بھی محفوظ ہیں۔ اب بھی ہر ماہ چاند کی چودھویں تاریخ کو معاوضے کے عوض شاہی دستر خوان پر روایتی کھانے سے لطف اندوز ہوا جا سکتا ہے۔

شیر باز کلیم بلتت قلعے کے سابق مینجر ہونے کے علاوہ تاریخ دان بھی ہیں۔ شیر باز کلیم کا کہنا تھا کہ بلتت قلعے کی تعمیر کو شہزادی شاہ خاتون سے منسوب کیا جاتا ہے جو کہ ابھی بھی تحقیق طلب ہے۔ ان کا دعوی تھا کہ سائنسی بنیادوں پر کی گئی تحقیق میں پتا چلتا ہے کہ بلتت قلعے کی تاریخ تقریباً نو سو سال پرانی ہے۔

وہ کہتے ہیں 'اب شاید معاملہ یہ ہو کہ ہنزہ کے شاہی خاندان کے محلوں کا قیام شاہ خاتون سے پہلے اس ہی مقام پر مختصر یا چھوٹی عمارتوں کی صورت میں ہوتا ہو گا جن کو تبت کے کاریگروں نے بڑے پیمانے پر ایک بڑے قلعے کی عمارت میں ڈھال دیا ہو گا۔' ان کا کہنا تھا کہ شاہ خاتون بعد میں ہنزہ کی رانی بھی بنیں تھیں۔ انھوں نے بلتت قلعے کی خوبصورتی کے لیے بہت سے تبدیلیاں کروائی تھیں۔ اس کے علاوہ ان ہی کے دور میں اسلام کی تبلیغ کے علاوہ وسطی ایشیا سے اسماعیلی مبلغ بھی اس علاقے میں آئے تھے۔ اس بات پر کوئی اختلاف نہیں کہ ان کی دور میں 'چھوٹے تبت' سے ماہر کاریگر بھی آئے تھے۔

لوک روایات کے مطابق بلتستان سے آنے والے ماہرین تعمیرات ہر صورت میں اپنے شہزادی کے لیے ایک آرام دہ اور شاندار محل تیار کرنا چاہتے تھے۔ جس کے لیے انھوں نے دن رات ایک کر دیا تھا اور ریکارڈ مدت میں اپنی شہزادی کے لیے محل تعمیر کر کے سب کو حیران کر دیا تھا۔

التت فورٹ ہنزہ:

وادیٔ کے باشندے بروشو کہلاتے ہیں ـــ یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ وہ سکندر اعظم کے لشکر میں شامل یونانی فوجیوں کی اولادیں ہیں۔ یہی خیال پاکستان اور افغانستان کے پختونوں کے لیے تسلیم کیا جاتا ہے۔

التت کے قدیم شہر کے لوگوں کے بارے میں یہ کہا جاتا ہے کہ ان کا تعلق ۴۷ عیسوی میں سلطنت فارس کے ترقی پذیر اور زراعت سے وابستہ ترک قبیلے 'ہن' سے ہے۔ یہ مانا جاتا ہے کہ اس شہر کا پرانا نام ہنوکشال تھا جس کا مطلب ہنوں کا گاؤں ہے

التت قلعہ ہنزہ کے میروں (شاہی خاندان) نے تعمیر کروایا تھا تاکہ نگر کے میروں (جڑواں ریاست) کے سامنے اپنی طاقت کا مظاہرہ کر سکیں۔ یہ قلعہ ۱۱ ہویں صدی سے اب تک قراقرم کے آگے آب و تاب سے کھڑا ہے۔ یہ قلعہ لکڑی کے شہتیر پتھر اور مٹی کے حسین امتزاج سے بنایا گیا ہے۔

یہ قلعہ نہ صرف کئی حملہ آوروں کے حملوں میں ثابت قدم رہا ہے، بلکہ تعمیر کے بعد آنے والے زلزلوں میں بھی اپنا وجود باقی رکھتا آیا ہے جو کہ اسے اپنے دور کی حیرت انگیز اور فن تعمیر کی شاہکار تعمیرات میں سے ہے۔ ایک اونچی پہاڑی پر بنی اس عظیم الجثہ عمارت کے فن تعمیر کے شاہکار اور اس کو مکمل کرنے میں لگی محنت اور جفاکشی کو دیکھ کر انسان حیران رہ جاتا ہے۔ اس دور کی ٹیکنالوجی کو ذہن میں رکھتے ہوئے اس جوکھم بھرے کام کو ۱۱ ہویں صدی میں تصور کرنا بھی آپ کی سوچ سے باہر ہے۔

اعلیٰ درجے کی انجینئرنگ کا ثبوت پیش کرتی اپنے دور کی اس مضبوط ترین قلعہ بند عمارت کو ہنزہ شہر کی جائے پیدائش اور دارالخلافہ سمجھا جاتا ہے۔

یہ منفرد عمارت دریائے ہنزہ سے ۱۰۰۰ فٹ کی بلندی پر ہے اور اس کا واحد برج 'شکاری برج' کہلاتا ہے، جسے خصوصاً دورانِ جنگ پورے علاقے کی نگرانی کرنے کے لیے تعمیر کروایا گیا تھا۔ وادیء ہنزہ کو ہمیشہ سے کائیون رس (روس) اور چین کی فوجوں کی جانب سے حملوں کا خطرہ رہتا تھا۔

ٹاور کے اوپر کھڑے ہو کر آپ کو احساس ہو گا کہ اس ٹاور کی پوزیشن کتنی اہمیت کی حامل تھی۔ اتنی اونچائی سے ارد گرد میں موجود تمام پہاڑوں، چشموں، جنگلوں اور نہروں

کی آسانی سے نگرانی کی جاسکتی تھی، جس سے التت شہر کو اپنے دفاع کے لیے مناسب تیاری کا وقت مل سکتا تھا۔

تقسیم ہند کے بعد بھی ہنزہ ایک شاہی ریاست تھی لیکن یہ سلسلہ صرف ۱۹۷۲ تک چلا، جس کے بعد سماجی اور سیاسی اصلاحات نے شاہی خاندان سے اختیارات واپس لے لیے۔ التت قلعہ بعد میں آغاخان فاؤنڈیشن کو بطور تحفہ دے دیا گیا۔ ان کے ثقافتی محکمے نے قلعے کی بحالی کے لیے قابل تعریف کام کیا ہے جو کہ ۲۰۰۷ سے سیاحی میوزیم کے طور پر کام کر رہا ہے۔

ابتدائی دنوں میں یہ قلعہ شہر کی آبادی اور تاجروں سے گھرا ہوا تھا جو پوری دنیا سے اپنے ساتھ مال لاتے تھے اور قدیم شاہراہ ریشم کے روٹ کو استعمال کرتے ہوئے چین سے یہاں سے داخل ہوا کرتے تھے۔ جلد ہی یہ خطے کا ثقافتی مرکز بن گیا۔

سکردو: کھرفوچو قلعہ

بلتستان کے مختلف قلعے و محلات یہاں کے راجاؤں کی سیاسی، سماجی، معاشرتی اور ثقافتی زندگی کا ایک مرقع تھے۔

یہ قلعے دفاعی نقطہ نگاہ سے اونچے پہاڑ کی چوٹیوں پر بنائے جاتے رہے جو مضبوط تعمیر کا مستحکم نمونہ تھے اور ان کو آسانی سے فتح نہیں کیا جا سکتا تھا۔

قلعہ کھرپوچو سکردو شہر میں دریائے سندھ کے کنارے واقع سنگلاخ چٹان پر بنایا گیا ہے جو اپنے اندر سینکڑوں تاریخی داستانیں چھپائے نظر آتا ہے۔

اس تاریخی قلعے کو مقپون خاندان کے نامور راجہ ‘بوخا مقپون’ نے ۱۴۹۰ سے ۱۵۱۵ عیسوی کے دوران تعمیر کروایا تھا۔ اسی راجہ نے سکردو شہر بھی آباد کیا تھا۔ یوں قلعہ

کھرپوچو اور سکر دو شہر ہم عصر ہیں۔ آج کل اس کے صدر دروازے کے ساتھ والی دیوار پہ انگریزی حروف میں لکھا " KHARPHOCHO " دور ہی سے نظر آتا ہے۔

وخامقپون کے بعد کے حکمرانوں نے بھی اس کو وسعت دی اور اسے مضبوط سے مضبوط تر بنایا۔ کسی زمانے میں یہ قلعہ ناقابلِ تسخیر تھا۔ کھرفوچو نے بہت سے حملہ آوروں کو نامراد واپس جانے پر مجبور کیا۔ علی شیر خان انچن کے دور میں اس قلعے کو بہت زیادہ توسیع دی گئی۔ قلعے کے درمیان ایک محل تعمیر کیا گیا۔ اس محل کے سامنے پانی کا حوض تھا جو ہمیشہ لبالب بھرا رہتا تھا۔ خوراک ذخیرہ کرنے اور اسلحہ رکھنے کے لئے پہاڑ کاٹ کر کمرے بنائے گئے تھے۔ ایک عالیشان مسجد' سپاہیوں کے رہنے کے لیے بیرکیں اور زندان بھی یہاں موجود تھا۔ قلعے کی حفاظت کے لیے مختلف مقامات پہ حفاظتی چوکیوں' برجیوں اور مورچوں کا اعلیٰ انتظام موجود تھا۔ مورچوں اور چوکیوں پہ مسلح پہرہ دار اُس زمانے کے جدید ہتھیاروں سے لیس ہمہ وقت پہرے پہ مامور رہتے تھے۔

تاریخ دان یوسف حسین آبادی کے مطابق: 'شروع میں اس قلعے کو کھرپوچھے کہا جاتا تھا، دھیرے دھیرے کثرتِ استعمال سے وہ لفظ کھرپوچو میں بدل گیا۔

کھرفوچو کا صدر دروازہ سنگے ستاغو کہلاتا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ اس پہ شیر کی تصویر کندہ تھی۔ جب دروازہ بند ہوتا تو یہ شیر بہت ہیبت ناک دکھائی دیتا تھا۔ یہ دروازہ بہت مضبوط تھا۔ یہاں حفاظت کے دیگر خاطر خواہ انتظامات بھی موجود تھے۔ کھرفوچو تک آنے کا باقاعدہ راستہ موجود نہیں تھا' مقامی روایات کے مطابق زیرِ زمیں سرنگوں کے ذریعے قلعے تک آمد و رفت ہوتی تھی۔ جب علی شیر خان انچن گلگت تا چترال کی مہم پہ گیا ہوا تھا تو اس مدت میں اس کی مغل ملکہ "گل خاتون" نے کھرپوچو کا راستہ بنوایا۔ اپنی رہائش کے لیے

کھرپوچو کے دامن میں دریائے سندھ کے کنارے ایک خوبصورت محل تعمیر کیا۔ مقامی لوگوں نے ملکہ کے نام ”میندوق رگیالمو“ یعنی گل خاتون یا پھول ملکہ کی نسبت سے اسے میندوق کھر (پھول محل) کا نام دیا۔ اس محل کی پانچ منزلیں تھیں۔ اس میں چوبی کام دیکھنے سے تعلق رکھتا تھا جبکہ مختلف اقسام کے سنگِ مرمر کا استعمال اس قرینے سے کیا گیا تھا کہ دیکھنے والے حیرت میں مبتلا ہو جاتے تھے۔ اس محل کے سامنے موجود باغ اپنی ہیئت کی وجہ سے ہلال باغ کہلاتا تھا۔ ملکہ نے اس باغ تک پانی پہنچانے کے لیے گنگوپی نہر بنوائی جو اپنی جگہ فنِ تعمیرات کا حیرت انگیز نمونہ ہے۔ کھرفوچو کے شمال میں نانگمہ ژھر کے نام کا ایک بڑا باغ تھا جو ننگ ژھوق تک پھیلا ہوا تھا۔ جنوب مغرب میں ایک باغ رگیہ ژھر نام کا تھا۔ گنگوپی نہر کے اُس پار غورو ژھر یعنی پتھروں والا باغ موجود تھا۔ کرفوپی ٹوق یا کرٹوق سے سٹیلائٹ ٹاون تک ایک بڑا باغ چہار باغ کے نام سے مشہور تھا۔ ان باغات میں انواع و اقسام کے پھلدار و غیر پھلدار درخت‘ طرح طرح اور رنگ برنگ کے خوشبو بکھیرتے پھول دیکھنے والے کو مسحور کر دیتے تھے۔ یہاں بڑے سلیقے سے روشیں‘ تالاب‘ حوض اور فوارے بنائے گئے تھے‘ جنہیں دیکھنے والے کا جی خوش ہو جاتا تھا۔ عروج وزوال ہر شے کا مقدر ہے۔ مختلف وجوہات کی وجہ سے یہاں کے خوبصورت باغات کو بھی اجڑنے میں دیر نہیں لگی۔ محل ویران ہو گئے۔ کھرپوچو بھی لامحالہ ان تبدیلیوں سے متاثر ہوتا رہا۔ رہی سہی کسر ۱۸۴۰ء میں ڈوگروں کی آمد اور ان کے ظلم و ستم نے پوری کر دی۔ اس قلعے نے ڈوگروں کو کئی ماہ تک روکے رکھا لیکن سازش کے ذریعے اس پر قبضہ کیا گیا۔ قلعے میں گھمسان کی جنگ ہوئی‘ خون کے دریا بہائے گئے۔ انسانیت روتی‘ چیختی اور لرزتی رہی جبکہ درندگی اپنی تمام تر خباثتوں کے ساتھ انسانوں کا خون بہاتی اور قہقہے لگاتی رہی۔ لہو سے زمیں کو گل رنگ کرنے کے بعد کھرفوچو قلعے کو آگ لگا دی گئی۔ برسوں کی مشقت کے بعد بننے

والی عظیم عمارت سے اٹھنے والے شعلے آسمان سے باتیں کرنے لگے۔ کھر فوچو ایک سو آٹھ سالوں تک ڈوگرہ افواج کے زیرِ استعمال رہا۔ انہوں نے اپنی ضرورت کے مطابق اس کو دوبارہ تعمیر کیا اور تبدیلیاں کیں۔ ۱۹۴۸ء میں آزادی کا جذبہ مقامی لوگوں کی رگوں میں خون بن کر دوڑا تو انہوں نے بے سروسامانی کے عالم میں مضبوط اور جدید ہتھیاروں سے لیس ڈوگرہ افواج کو پسپا ہونے پر مجبور کر دیا۔ آزادی کی یہ جنگ کھر فوچو کے دامن میں لڑی گئی۔ قلعہ کھر فوچو سکردو کی پہچان ہے۔ یہاں کے لوگ بھی اس سے بہت پیار کرتے ہیں اور اس کے کھنڈرات میں اپنے درخشاں ماضی کی بکھری تصویروں کو تصور کی آنکھ سے دیکھتے ہیں۔ یہاں سے سکردو کا نظارا ناقابلِ بیان حد تک خوبصورت ہے۔ دیکھنے والا مسحور ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ یہ تاریخی ورثہ جس توجہ کا مستحق ہے اسے وہ آج تک نہیں مل سکی جس کی وجہ سے یہ تاریخی ورثہ آہستہ آہستہ بوسیدگی کی طرف مائل ہے ضرورت اس امر کی ہے کہ ذمہ دار ادارے اس تاریخی ورثے کی حفاظت کے ساتھ ساتھ اس کے حوالے سے دنیا بھر کے سیاحوں کو مستند معلومات بھی فراہم کریں

KHARPHOCHO

شگر قلعہ، شگر سکردو:

شگر فورٹ (فونگ کھر)

شگر فورٹ جس کا بلتی زبان میں نام ہے فونگ کھر جس کے معنی ہیں چٹان والا قلعہ، جو کہ پاکستان کے گلگت بلتستان علاقے شگر سکردو میں واقع ہے۔ یہ قلعہ ۱۷ویں صدی میں حسن خان اماچہ نے تعمیر کروایا۔ یہ قلعہ تباہ حالی کا شکار تھا، لیکن آغا خان کلچرل سروس پاکستان (AKCSP) نے اسے دوبارہ بحال کیا اور اب یہ ایک خوبصورت ہوٹل کے طور پر استعمال ہوتا ہے۔ شگر فورٹ کی تعمیرات میں تبتی، بلتی اور مغلیہ طرزِ تعمیر کی جھلکیاں نظر آتی ہیں۔ اس قلعے میں ایک میوزیم بھی موجود ہے جس میں قدیم نوادرات اور فن پارے رکھے گئے ہیں۔

یہاں اب سرینا شگر فورٹ ہوٹل بنا دیا گیا ہے، قلعہ کی تعمیر میں مقامی مواد اور روایتی طرزِ تعمیر کا استعمال کیا گیا، جس میں لکڑی کی خوبصورت کندہ کاری شامل ہے۔ یہ قلعہ شگر وادی کے دل میں واقع ہے، جہاں سے ہمالیہ کے دلکش مناظر نظر آتے ہیں۔ شگر قلعہ کو ۲۰۰۴ میں حکومت نے ثقافتی ورثے کے طور پر محفوظ کیا، اور اس کی مرمت کی گئی۔ یہ قلعہ آج کل سیاحوں کے لیے ایک مقبول منزل ہے، جہاں لوگ تاریخ اور ثقافت کے ساتھ ساتھ قدرتی حسن بھی دیکھ سکتے ہیں۔ قلعہ میں مختلف کمرے اور ایک چھت ہے جو اس کی تاریخی اہمیت کو بڑھاتی ہیں۔

شگر قلعہ، شگر نیشنل پارک کے قریب واقع ہے، جو کہ قدرتی حیات اور خوبصورت مناظر کے لیے جانا جاتا ہے۔ یہ قلعہ نہ صرف تاریخی اہمیت رکھتا ہے بلکہ یہ پاکستان کے ثقافتی ورثے کی ایک اہم علامت بھی ہے

مسگر قلعہ (قلندرچی فورٹ):

ہنزہ کے بالائی علاقے سب ڈویژن گوجال میں واقع دور افتادہ گاؤن مسگر تاریخی لحاظ سے بہت ہی اہمیت کا حامل رہا ہے۔ اس کی سرحدیں چین اور پاکستان کیساتھ لگنے کی وجہ سے قدیم زمانے میں ہنزہ سٹیٹ کی سرحدوں کو محفوظ رکھنا اشد ضروری اور انتہائی مشکل کام ہوتا تھا۔ ان سرحدوں کی دفاع کی خاطر مسگر کو ۱۸۴۴ء میں آباد کرایا گیا۔ اس سلسلے میں میر آف ہنزہ نے سنٹرل ہنزہ کے چاروں قبائل سے چن چن کر لوگوں کو یہاں لاکر بسایا تاکہ سرحد پار سے ہونے والے حملوں کو روکا جاسکے۔

یہ قلعہ شاہراہ قراقرم پر واقع پاکستان کے آخری قصبے سوست سے **۲۲** کلو میٹر دوری پر ہے۔ سوست سے سات کلو میٹر خنجراب کی طرف شاہراہ ریشم پر سفر کریں تو دائیں طرف سڑک کنارے ایک بورڈ لگا ہوا نظر آتا ہے۔ یہاں پر دریائے کلک اوپر پہاڑوں سے آکر دریائے خنجراب میں گرتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ چلتے جائیں تو دس کلو میٹر کے فاصلے پر مسگر کا خوبصورت گاؤں ہے۔ مزید ۶ کلو میٹر آگے یہ قلعہ آتا ہے۔ جس کا نام کسی بزرگ کے نام پر رکھا گیا تھا۔ یہاں سے آگے آبادی بالکل بھی نہیں ہے۔ کچھ چراگاہیں ہیں جو زیادہ تر پہاڑوں کے بیچ یا پہاڑوں کے اوپر ہیں۔ ایک ٹریک مرکشی کے مقام سے دائیں طرف منتاکہ پاس کو جاتا ہے جب کہ دوسرا سیدھا کلک پاس کی جانب چلا جاتا ہے۔ یہ دونوں رستے واخان کوریڈور سے ہو کر روس میں جانکلتے ہیں۔ جبکہ ایک ٹریک بائیں جانب درہ دلسنگ کی جانب افغانستان کی طرف چلا جاتا ہے۔ یہ قلعہ ان تینوں رستوں کے سنگم پر بنایا گیا تھا۔

تاکہ افغانستان، چین اور روس کی جانب سے آنے والے حملہ آوروں اور دوسرے در اندازوں کو روکا جاسکے۔

تاریخ کے مطابق برٹش نے ہنزہ کو ۱۸۹۲ء میں اپنے زیر تسلط لایا اور وخان کوریڈور کو کنٹرول کرنے کی خاطر ۱۹۳۰ء میں تاریخی قلندرچی قلعہ تعمیر کیا۔ مذکورہ قلعے کی سٹریٹیجیک لحاظ سے بھی ایک منفرد تاریخ ہے۔ یہ قلعہ روسو-برٹش وار کی تاریخ بھی اپنے اندر سمویا ہوا ہے۔ ٹوریزم کے لیے قلعہ کھلنے سے ایک طرف اس کی تاریخ دنیا کے کونے کونے تک پہنچنے میں مدد ملے گی تو دوسری طرف ہنزہ کے دورافتادہ گاوں کے باسیوں کے لیے کاروبار کا ایک نیا موقع بھی پیدا ہو گا۔ جون ۲۰۲۴ میں یہ قلعہ سیاحوں کے لیئے کھول دیا گیا ہے۔

KALAM DARCHI FORT
(THE LAST BRITISH POST IN THE NORTH)
OPEN FOR TOURISTS
FROM
9AM TO 5PM
KD FORT
MISGAR VALLEY
Misgar Roof of the world

خپلو فورٹ (تھوقسی کھر)

خپلو فورٹ، جسے ”خپلو پیلس“ بھی کہا جاتا ہے، گلگت بلتستان کے علاقے میں واقع ہے، خپلو قلعہ کو یابگو کھر کے نام سے بھی جانا جاتا ہے، جس کا مطلب ہے "چھت پر واقع قلعہ" اور یہ شمالی پاکستان کی تاریخی عمارتوں میں سے ایک ہے۔ یہ قلعہ بلتستان کے خوبصورت وادیوں میں، دریائے شیوک کے کنارے واقع ہے اور اس کی تعمیر کے ساتھ علاقے کی تاریخ اور ثقافت کی جھلک نمایاں ہے۔

خپلو فورٹ کی تعمیر ۱۹ویں صدی کے اوائل میں ہوئی، اور یہ یبگو خاندان کے آخری تاجدار راجہ داور خان کے دور میں بنایا گیا تھا۔ یہ قلعہ بلتی اور تبتی طرزِ تعمیر کا خوبصورت امتزاج ہے، جس میں لکڑی اور پتھر کا عمدہ استعمال نظر آتا ہے۔ عمارت کو اس انداز میں بنایا گیا ہے کہ یہ سردیوں کی سختی اور موسم کی شدت سے محفوظ رہے۔ یہاں کے ستون، دروازے اور کھڑکیاں نفیس نقش و نگار سے مزین ہیں جو اس خطے کی روایتی فنکاری کا اظہار ہیں۔

قلعے کی تعمیر کا مقصد نہ صرف رہائش فراہم کرنا تھا بلکہ اسے دفاعی طور پر بھی اہمیت حاصل تھی۔ یہ قلعہ مختلف حکمرانوں اور خاندانوں کے زیرِ استعمال رہا ہے اور آج اسے ایک تاریخی ورثے کے طور پر محفوظ کر دیا گیا ہے۔ خپلو فورٹ میں ایک میوزیم بھی قائم کیا گیا ہے جس میں بلتستان کی ثقافتی اور تاریخی اشیاء کو نمائش کے لیے رکھا گیا ہے، جیسے کہ قدیم ہتھیار، روایتی لباس، اور دستکاری کے نمونے۔

خپلو فورٹ کی حیثیت آج سیاحتی مرکز کے طور پر بھی ہے، جہاں دنیا بھر سے سیاح بلتستان کی خوبصورتی اور ثقافت کو دیکھنے کے لیے آتے ہیں۔ قلعہ بلند پہاڑوں، سرسبز وادیوں اور نیلے آسمان کے دلفریب مناظر کے درمیان واقع ہے، جو اسے ایک خوابناک منظر عطا کرتے ہیں۔ یہاں کا ماحول سکون اور خوبصورتی کا ایسا امتزاج پیش کرتا ہے جسے دیکھنے کے بعد دل کو سکون ملتا ہے۔

خپلو فورٹ نہ صرف اپنی خوبصورتی کے لیے مشہور ہے بلکہ یہ بلتستان کے ثقافتی اور تاریخی ورثے کا ایک زندہ ثبوت بھی ہے، جو اس خطے کی عظمت، فن اور تاریخ کو آنے والی نسلوں کے لیے محفوظ رکھے ہوئے ہے۔ یہ فورٹ بھی اب ایک ہوٹل میں بدل دیا گیا ہے۔

پنجاب کے قلعے:

فورٹ منرو:

ایک خوبصورت پہاڑی مقام ہونے کے سبب فورٹ منرو کو جنوبی پنجاب کا مری بھی کہا جاتا ہے۔ یہاں کا موسم ٹھنڈا اور خوشگوار ہوتا ہے اور بارش کی صورت میں یہ مقام مزید حسین مناظر پیش کرنے لگتا ہے۔ جس کی بناء پر پنجاب کی گرمی کے ستائے لوگ اس قریبی مقام پر سکون کی تلاش میں آتے ہیں۔ پنجاب میں ایک الگ اہمیت اور شناخت کی بناء پر اسے سیاحوں کی جنت بھی کہا جاتا ہے۔

فورٹ منرو پنجاب کے جنوبی حصے میں واقع شہر ڈیرہ غازی خان سے تقریباً ۸۵ کلومیٹر اور ملتان سے تقریباً ۱۸۵ کلومیٹر کے فاصلے پر کوہِ سلیمان کے پہاڑی سلسلے میں واقع

ہے جس کی اونچائی ۱۸۰۰ میٹر ہے۔ یہ خوبصورت مقام سطح سمندر سے ۶,۴۷۰ فٹ کی بلندی پر واقع ہے۔

بعض مورخین کے مطابق فورٹ منرو کا پرانا نام "اناری" تھا جسے برصغیر پر انگریزوں کے قبضے کے بعد سر رابرٹ سنڈیمن نے ۱۸۶۹ میں تیار کیا تھا۔ اس کا نام برطانوی فوج کے ایک افسر لیفٹیننینٹ کرنل جارج منرو (جسے تمن لغاری بھی کہا جاتا ہے) کے نام پر رکھا گیا تھا جو بعد ازاں فورٹ منرو کہلایا اور جسے ۱۹ویں صدی کے آخر میں ایک پہاڑی شہر کے طور پر تیار کیا گیا تھا

فورٹ منرو ۱۹۵۰ء میں ایک آزاد قبائلی علاقہ تھا جو بعد میں اکثریتِ رائے سے پنجاب کا مستقل حصہ بن گیا۔ قلعہ کے آثار اب تقریباً مٹ چکے ہیں اور وہاں صرف کچھ خستہ حال دیواریں باقی ہیں۔ یہ وہ جگہ تھی جہاں بلوچوں نے انگریزوں سے مقابلہ کیا تھا۔

اٹک قلعہ:

اگست ۱۵۸۱ء میں مغل شہنشاہ اکبر نے اٹک کے قلعہ کی بنیاد رکھی جب اس نے گورنر کابل محمد حکیم مرزا پر فتح پائی۔

اٹک شہر، صوبہ پنجاب کے شمال میں دریائے سندھ کے بائیں کنارے واقع ہے، جسے انگریز سامراج کے ایک افسر مسٹر کیمبل نے ۱۹۰۴ء میں کیمبل پور کے نام سے آباد کیا تھا۔ تاہم، شہر سے تھوڑے فاصلے پر اٹک خورد (چھوٹا اٹک) کے نام سے ایک گاؤں پہلے سے ہی آباد تھا۔ دریائے سندھ پاکستان کے دو صوبوں پنجاب اور خیبر پختونخوا کو اٹک کے مقام پر تقسیم کرتا ہے۔

ایک اور کہانی جو اس قلعہ کی تعمیر کی بابت ملتی ہے، وہ یہ ہے کہ اکبر نے جب دیکھا کہ دریائے سندھ پار نہیں ہوتا تو اس نے اس جگہ کو ایک نام دیا "اٹک "یعنی "روک "۔ جب وہ پار کر گیا تو اس نے خیر آباد کا نام دیا۔ اس موقع پر اکبر نے یہاں ایک بڑا بیڑہ تیار کرایا اور جمنا سے بہت سے ملاح لا کر یہاں آباد کئے۔ آج بھی ان کے وارثان اس جگہ سے مالی منفعت اٹھا رہے ہیں جو دریا کے کنارے رہائش پذیر ہیں۔ اس آبادی کا نام "ملاحی ٹولہ " ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ماضی میں حملہ آوروں کو دریائے سندھ کی وجہ سے یہاں رکنا پڑتا تھا۔ مغل شہنشاہ اکبر نے اس علاقہ کی دفاعی اہمیت کے پیش نظر ۱۶ ویں صدی میں جب قلعہ تعمیر کروایا تو اس کا نام اٹک قلعہ رکھا۔ یہ قلعہ دریائے سندھ کے کنارے راولپنڈی سے ۵۸ میل اور پشاور سے جرنیلی سڑک پر ۴۷ میل کی مسافت پر سطح سمندر سے بلند دو چٹانوں کملیہ اور جلیلہ کے درمیان واقع ہے۔

قلعہ کی تعمیر کے بعد اکبر نے پہلی بار ۱۵۸۵ء میں اسے دیکھا اور کئی ماہ یہاں قیام کیا۔ اس دوران اس نے وہاں تانبے کے سکوں کی ٹکسال قائم کی۔

قلعہ کے چاروں اطراف بے شمار دشمن قبائل کی سکونت کی وجہ سے دفاعی اعتبار سے اس مقام کی خاص اہمیت تھی۔ اسے خالصتاً فوجی مقاصد کے لیے تمام جنگی ہتھیاروں کے استعمال کو مد نظر رکھ کر تعمیر کیا گیا۔ اسی وجہ سے اس میں اٹھارہ برج بنائے گئے جو تمام کے تمام گولائی میں ہیں ماسوائے ایک کے جو زاویہ قائمہ پر ہے۔ برجوں کی تعمیر مقامی چٹانی پتھر سے کر کے ان پر چونے کی دبیز تہہ چڑھائی گئی ہے۔

قلعہ سطح سمندر سے بلند ہے جو ایک خطرناک علاقے اور دو چٹانوں کملیہ اور جلیلہ کے درمیان واقع ہے۔ ان چٹانوں کا نام کمال الدین اور جلال الدین کے نام پر رکھا گیا جو روشنیہ فرقہ کے بانی کے دو بیٹے تھے، جنہیں دریا میں سزا کے طور پر پھینکا گیا کیونکہ وہ اپنے باپ کے نظریات کا پرچار اکبر کے دور میں کرتے تھے۔

قلعہ کے ایک برج کی بنیاد ازراہ دور اندیشی دریا میں رکھی گئی تاکہ اگر دشمن کے حملے کی وجہ سے قلعہ بند ہونا پڑے تو قلعہ میں پانی کی محتاجی نہ ہو کیونکہ پہاڑی علاقہ ہونے کی وجہ سے اس میں سوائے دریا کے پانی کے کنویں کا پانی حاصل ہونا ممکن نہ تھا۔ چار صدیوں سے زائد عرصہ گزر جانے کے باوجود قلعہ کا برج آج بھی اسی استحکام سے دریا میں موجود ہے اور اس طرح مضبوط ہے کہ گویا حال ہی میں تعمیر کیا گیا ہو۔ قلعہ اٹک کی تعمیر سے یہ علاقہ صدیوں شمالی حملہ آوروں کی یلغار سے محفوظ رہا۔

داخلی دروازوں پر سرخ پتھر استعمال ہوا ہے جبکہ قلعہ کا دیگر حصہ لاجوردی ٹائیلوں سے بنا ہے۔ اس کاویلر نے اپنی کتاب "فائیو تھاؤزینڈس ائیر آف پاکستان" میں دیا ہے۔

قلعہ کی تعمیر کا دلچسپ پہلو وہ گیلری ہے جو برجوں کو باہم ملاتی ہے۔ یہ گیلری حملہ آوروں سے آگے پیچھے سے بچانے کا ایک ٹھوس ذریعہ ہے۔ گیلری کے زیادہ حصے کی چھت اخروٹ کی لکڑی سے بنی ہے۔ ایک جگہ سنگ مرمر کی موٹی سلیب بنائی گئی ہے اور قلعہ کو تمام جنگی ہتھیاروں کے استعمال کو مد نظر رکھ کر بنایا گیا ہے۔

اٹک قلعہ مغل حکمرانوں کے مخصوص طرزِ تعمیر کا عکاس ہے۔ قلعہ میں فن تعمیر کا بہترین نمونہ اس کی چار دیواری کی تعمیر ہے جو چاروں اطراف سے ایک میل طویل ہے۔ قلعے کے برجوں کو آپس میں ملانے کے لیے دیوار کے ساتھ ساتھ ایک راہداری (گیلری) بھی تعمیر کی گئی ہے، جس کے نیچے گارڈز کے لاتعداد کمرے ہیں۔ اسی طرح کے کمرے میناروں کے نیچے بھی موجود ہیں۔

راہداری حملہ آوروں سے بچانے کا ایک ٹھوس ذریعہ تھی، جس کے زیادہ تر حصے کی چھت اخروٹ کی لکڑی سے بنی ہے مگر ایک جگہ سنگ مرمر کی موٹی سلیب بھی بنائی گئی ہے۔ شمالی درمیانی راستے کے مینار کی اوپری دیوار سے دریائے سندھ کا نظارہ بخوبی ہوتا ہے اور اسی درمیانی راستے سے چار دروازوں والا حصہ جو مینار کے سامنے ہے، ایک چھجہ سے آراستہ ہے اور پورے قلعہ میں یہی وہ عمارت ہے جو محض رہائش کے لیے بنائی گئی ہے اور آج تک اسی مقصد کے لیے استعمال ہو رہی ہے۔

قلعے میں چار بڑے دروازے (دلی گیٹ، لاہوری گیٹ، کابلی گیٹ اور موری گیٹ) ہیں۔ ان داخلی دروازوں کی تعمیر میں سرخ پتھر استعمال کیا گیا ہے جبکہ قلعہ کا دیگر حصہ لاجوردی ٹائلز سے بنا ہے۔ ان بلند و بالا دروازوں پر خوبصورت نقش کاری کی گئی ہے۔ آہنی راڈوں سے مزین دلی اور کابلی گیٹ مست ہاتھیوں کے حملوں کی روک تھام کے لیے بنائے گئے تھے۔ دلی گیٹ کے پاس ایک بڑا گارڈ روم موجود ہے، جو قیام پاکستان سے قبل تک کوارٹر گارڈ کے طور پر استعمال ہوتا رہا۔ قلعہ کے اندر داخلہ موری گیٹ کے راستے سے ہے جو پرانے جی ٹی روڈ کے عین سامنے واقع ہے اور جس کی تاریخ سکھ دور سے متعلقہ ہے جو ۱۸۳۰ء ہے۔

لاہوری گیٹ قلعہ کا پرانا دروازہ ہے اور زیادہ تر سپاہی یہی دروازہ استعمال کرتے تھے جو بازار کو جاتا تھا۔ قلعہ کا اسلحہ خانہ ۱۸۵۷ء میں بنایا گیا تھا جو پرانے لاہوری گیٹ کی جگہ پر تھا۔ دلی گیٹ کے اندر سے گزرتے ہوئے قلعہ کے نیچے اور اوپر والے حصے میں داخل ہوا جاسکتا ہے۔ پرانا جی ٹی روڈ لاہوری گیٹ کے اندر سے گزر کر شہر کے بازار سے گزرتا ہوا کابلی گیٹ سے ملاحی ٹولہ گیٹ کی طرف دریا کے کنارے نکل جاتا تھا۔

دلی گیٹ سے اندر جائیں تو اس طرف ایک بہت بڑا سا معین کا ہال ہے۔ قلعہ کے اوپری حصہ میں خواتین کے لیے ترکی کی طرز پر منفرد حمام ہے جو کہ مغلوں کا ایک خاصہ ہے۔ حمام سے پہلے ایک داخلی ہال اور چھوٹے چھوٹے کمرے ہیں۔ یہاں ستونوں کو خوبصورتی سے مزین کیا گیا ہے۔ داخلی ہال میں خواتین کے لیے سردی اور گرمی کے لیے مخصوص کمرے ہیں جہاں وہ اپنی مرضی سے گرم یا ٹھنڈے پانی کا استعمال کرتی تھیں۔

دوہری دیوار آج بھی دیکھی جاسکتی ہے جہاں پانی گرم کر کے بھاپ مہیا کی جاتی تھی۔ اس حصہ سے ایک خفیہ سرنگ لاہوری گیٹ کو جاتی ہے جو زیرِ زمین ہال تک چلی جاتی ہے، جہاں شاہی بیگمات آرام کرتی تھیں۔ قلعہ کے نچلے حصے میں روشنی کا نظام مہیا کیا گیا ہے۔

قلعہ کی شمالی طرف اور دریا کے بائیں کنارے بیگم کی سرائے عمارت موجود ہے۔ یہ جگہ قلعہ کی تعمیر کے وقت میٹریل رکھنے کیلئے استعمال کی گئی۔ اسے جہانگیر نے سترہویں صدی میں نور جہاں کی خواہش پر بنایا تھا۔ بیگم سرائے کا صحن ۱۳۳۱ مربع فٹ اور تین محرابوں والی چھوٹے گنبدوں سے آراستہ مسجد سے متصل ہے۔ صحن کے اطراف میں

رہائشی کمرے بنے ہوئے ہیں اور اس کے چاروں کونوں میں پتھر کے مینار ایستادہ ہیں۔ یہ صحن مغلوں کیلئے راستے میں ستانے کی جگہ تھا۔ جب وہ واہ باغ کی طرف سفر کرتے تو یہاں قیام کرتے۔ سرائے کے مغربی حصہ میں کنواں ہے جہاں سے خفیہ سرنگ دریا تک جاتی ہے جہاں دو اور سرنگیں نکلتی ہیں۔ یہ راستہ اعلیٰ انجینئرنگ کی مثال ہے۔ ۱۸۸۳ء تک یہاں کشتیوں کا پل تھا۔ ۱۸۸۰ء میں شروع ہونے والا پل ۱۸۸۳ء میں مکمل ہوا جو آج صوبہ خیبر پختونخوا کو پنجاب سے ملاتا ہے۔

جنگی اہمیت اور ہیبت کے اعتبار سے ضلع اٹک کی خاصی اہمیت ہے۔ انگریز سامراج نے اپنے توپ خانے کیلئے اٹک کو ہی چنا تھا، تقسیم ہند کے بعد اٹک قلعہ کو پاکستان آرمی کے ساتویں ڈویژن کا ہیڈ کوارٹر بنا دیا گیا۔ ۱۹۵۶ء کے بعد قلعے کو اسپیشل سروسز گروپ آف پاکستان کے حوالے کر دیا گیا۔

اٹک قلعہ کے گرد و نواح میں خوبصورت ترین مقامات میں سے ایک مقام باغ نیلاب ہے۔ اس کے علاوہ پانی کا پھیلاؤ اور کالا چٹا کی سرسبز پہاڑیاں اس علاقے کی خوبصورتی میں خاطر خواہ اضافہ کرتی ہیں۔

قلعہ روہتاس جہلم:

یہ واحد قلعہ ہے جس پر کبھی یلغار نہیں کی گئی، اس کے حصول کے لیے کوئی بڑی جنگ نہیں لڑی گئی اور نہ کبھی اس کا محاصرہ ہوا، کہا جاتا ہے کہ یہ قلعہ شیر شاہ سوری نے

گکھڑ قبائل کو اپنے زیر نگیں لانے کے لیے کثیر لاگت سے یوں تعمیر کیا تھا کہ اس کے پتھر کی ہر سل کی تنصیب کے لیے ایک ایک اشرفی معماروں کو عطا کی گئی تھی، کیونکہ گکھڑ قبائل کے خوف سے کوئی بھی تعمیر کرنے پر آمادہ نہیں تھا۔

دیواریں اپنی بنیاد پر تیس فٹ چوڑی اور تیس سے پچاس فٹ بلند ہیں اس میں ارسٹھ برج ہیں اور دیواروں میں بندوقوں اور تیروں کے لیے روزن اور یہاں توپوں کے لیے سوراخ ہیں منڈیر پر راستے کے نزدیک خفیہ ٹھکانے ہیں جن میں پگلا ہوا سیسہ اور ابلتہ ہوا پانی حملہ آوراں پر انڈیلا جاسکتا تھا قلعہ کا کبھی بھی محاصرہ نہیں کیا گیا تھا۔۔ ان میں سے کچھ دروازے اندر پہنچنے کیلیے تعمیر کیے گئے تھے اب اس کے مختلف حصے کھنڈرات بن چکے ہیں خاص طور پر شمال کی طرف سے جہاں دیوارں کا ایک بڑا حصہ گر چکا ہے دوسری جگہوں پر نرم سرخ پتھروں کی بنیادیں فرسودہ ہو چکی ہیں دیوارون کو صرف عمدہ تعمیراتی سامان کے سہارے چھوڑ دیا گیا جس سے وہ تعمیر کی گئ ہیں، شمال مغربی اور مشرقی گزر گاہ کے ساتھ مستطیل نما دیزائن کا منصوبہ تیار کیا گیا ہے یہ گزر گاہیں بیس فٹ اونچی اور محرابی ہیں اور ابھی تک موجود ہیں جب کے ان کے بڑے بڑے حصے کافی عرصے سے غائب ہو چکے ہیں تاہم ابھی تک بہت سے راستے استعمال کیلیے مناسب ہیں سب سے بہتر گزر گاہ سہیل دروازہ ہے جو کہ ستر فٹ بلند اور ٹلہ جوگیاں کی سمت ہے۔

شیر شاہ سوری کا قلعہ روہتاس جرنیلی سڑک پر جہلم میں واقع ہے۔ دریائے جہلم بھی یہاں ہی ہے جسے عبور کرنا سکندر اعظم کے لئے دوبھر ہو گیا تھا اور ایک دفعہ تو اسے راجہ پورس نے ناکوں چنے چبوا دیئے تھے۔ "خواص خانی” دروازے سے قلعے میں داخل ہو

اجاتا ہے۔ قلعہ میں سب سے حیران کن چیز باؤلی یعنی "سیڑھیوں والے کنویں“ ہے۔ قریبی فصیل پر بھی چڑھا جا سکتا ہے۔ یہ آپ کو ۶ صدیاں پیچھے تاریخ میں لے جاتا ہے۔ آج یہ کھنڈرات میں تبدیل ہو رہا ہے۔

شیر شاہ سوری کا تعمیر کیا گیا قلعہ ۹۴۸ھ میں مکمل ہوا۔ جو پوٹھوہار اور کوہستان نمک کی سرزمین کے وسط میں تعمیر کیا گیا ہے۔ جس کے ایک طرف نالہ کس، دوسری طرف نالہ گھان تیسری طرف گہری کھائیاں اور گھنا جنگل ہے۔ شیر شاہ سوری نے یہ قلعہ گکھڑوں کی سرکوبی کے لیے تعمیر کرایا تھا۔ دراصل گکھڑ مغلوں کو کمک اور بروقت امداد دیتے تھے، جو شیر شاہ سوری کو کسی طور گوارا نہیں تھا۔ جب یہ قلعہ کسی حد تک مکمل ہو گیا تو شیر شاہ سوری نے کہا کہ آج میں نے گکھڑوں کی پیٹھ میں چھرا گھونپ دیا ہے۔ اس قلعے کے عین سامنے شیر شاہ سوری کی بنائی ہوئی جرنیلی سڑک گزرتی تھی، جو اب یہاں سے پانچ کلومیٹر دور جا چکی ہے۔ دوسرے قلعوں سے ہٹ کر قلعہ روہتاس کی تعمیر چھوٹی اینٹ کے بجائے دیوہیکل پتھروں سے کی گئی ہے۔ ان بڑے بڑے پتھروں کو بلندیوں پر نصب دیکھ کر عقل حیران رہ جاتی ہے۔ ایک روایت کے مطابق اس قلعے کی تعمیر میں عام مزدوروں کے علاوہ بے شمار بزرگانِ دین نے اپنی جسمانی اور روحانی قوتوں سمیت حصہ لیا تھا۔ ان روایات کو اس امر سے تقویت ملی ہے کہ قلعے کے ہر دروازے کے ساتھ کسی نہ کسی بزرگ کا مقبرہ موجود ہے، جب کہ قلعے کے اندر بھی جگہ جگہ بزرگوں کے مقابر موجود ہیں، اس کے علاوہ ایک اور روایت ہے کہ یہاں قلعے کی تعمیر سے پہلے ایک بہت بڑا جنگل تھا۔ شیر شاہ سوری کا جب یہاں سے گزر ہوا تو یہاں پر رہنے والے ایک فقیر نے شیر شاہ سوری کو یہاں قلعہ تعمیر کرنے کی ہدایت دی۔

اخراجات: ایک روایت کے مطابق "ٹوڈرمل" نے اس قلعے کی تعمیر شروع ہونے والے دن مزدوروں کو فی سلیب (پتھر) ایک سرخ اشرفی بہ طور معاوضہ دینے کا اعلان کیا تھا۔ گو قلعہ کی تعمیر پر اٹھنے والے اخراجات کا درست اندازہ نہیں لگایا جاسکتا تاہم ایک روایت کے مطابق اس پر اس زمانے کے ۳۴لاکھ ۲۵ ہزار روپے خرچ ہوئے۔ جس کا تخمینہ آج کے اربوں روپے بنتے ہیں۔ واقعات جہانگیری کے مطابق یہ اخراجات ایک پتھر پر کندہ کیے گئے تھے جو ایک زمانے میں قلعے کے کسی دروازے پر نصب تھا۔ قلعے کی تعمیر میں ۳ لاکھ مزدوروں نے بہ یک وقت حصہ لیا اور یہ ۴ سال ۷ ماہ اور ۲۱ دن میں مکمل ہوا۔ یہ چار سو ایکٹر پر محیط ہے، جب کہ بعض کتابوں میں اس کا قطر ۴ کلومیٹر بیان کیا گیا ہے۔ قلعے کے بارہ دروازے ہیں۔ جن کی تعمیر جنگی حکمت عملی کو مد نظر رکھ کر کی گئی ہے۔ یہ دروازے فن تعمیر کا نادر نمونہ ہیں۔ ان دروازوں میں خواص دروازہ، موری دروازہ، شاہ چاند والی دروازہ، طلاقی دروازہ، شیشی دروازہ، لنگر خوانی دروازہ، بادشاہی دروازہ، کٹیالی دروازہ، سوہل دروازہ، پیپل والا دروازہ، اور گڈھے والا دروازہ، قلعے کے مختلف حصوں میں اس کے دروازوں کو بے حد اہمیت حاصل تھی۔ اور ہر دروازہ کا اپنا مقصد تھا جبکہ خاص وجہ تسمیہ بھی تھی۔ ہزار خوانی صدر دروازہ تھا۔ طلاقی دروازے سے "دور شیر شاہی" میں ہاتھی داخل ہوتے تھے۔ طلاقی دروازے کو منحوس دروازہ سمجھا جاتا تھا۔ شیشی دروازے کو شیشوں اور چمکتی ٹائلوں سے تیار کیا گیا تھا۔ لنگر خوانی لنگر کے لیے استعمال ہوتا تھا۔ کابلی دروازے کا رخ چونکہ کابل کی طرف تھا اس لیے اس کو کابلی دروازہ کہا جاتا تھا۔ سوہل دروازہ زحل کی وجہ سے سوہل کہلایا۔ جبکہ اس کو سہیل دروازہ بھی کہا جاتا تھا کیونکہ حضرت سہیل غازی کا مزار یہیں واقع تھا۔ گٹیالی دروازے کا رخ چونکہ گٹیال پتن کی طرف تھا اس

لیے اس کو یہی نام دیا گیا۔ اس طرح مختلف دروازوں کے مقاصد مختلف تھے۔ قلعہ روہتاس کا سب سے قابلِ دید، عالی شان اور ناقابل شکست حصہ اس کی فصیل ہے۔ اس پر ۶۸ برج، ۱۸۴ برجیاں، ۶۸۸۱ کنگرے اور ۸۵۵۶ سیڑھیاں ہیں جو فن تعمیر کا نادر نمونہ ہیں۔ یہ بات حیرت انگیز ہے کہ اتنے بڑے قلعے میں محض چند رہائشی عمارتیں تعمیر کی گئی ہیں۔ قلعے کی عمارتوں میں سے ایک عمارت کو شاہ مسجد کہا جاتا ہے اور چند باؤلیاں تھیں، بعد ازاں ایک حویلی تعمیر کی گئی، جسے راجا مان سنگھ نے بنوایا تھا۔ محلات کے نہ ہونے کے باعث مغل شہنشاہ اس قلعے میں آ کر خیموں میں رہا کرتے تھے۔ یہ قلعہ صرف دفاعی حکمت علمی کے تحت بنایا گیا تھا، اس لیے شیر شاہ سوری کے بعد بھی برسر اقتدار آنے والوں نے اپنے ٹھہرنے کے لیے یہاں کسی پر تعیش رہائش گاہ کا اہتمام نہیں کیا۔

قلعہ روہتاس دیکھنے والوں کو ایک بے ترتیب سا تعمیری ڈھانچا نظر آتا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ شیر شاہ سوری نے اسے تعمیر کرتے ہوئے نقش نگاری اور خوب صورتی کے تصور کو فراموش نہیں کیا۔ قلعے کے دروازے اور بادشاہی مسجد میں کی جانے والی میناکاری اس کا واضح ثبوت ہے۔ ہندوانہ طرز تعمیر کی پہچان قوسین قلعے میں جابجا دکھائی دیتی ہیں۔ جن کی بہترین مثال سوہل گیٹ ہے۔ اسی طرح بھر بھرے پتھر اور سنگ مر مر کی سلوں پر کندہ مختلف مذہبی عبارات والے کتبے خطابی کے نادر نمونوں میں شمار ہوتے ہیں۔ جو خط نسخ میں تحریر کیے گئے ہیں۔ خواص خوانی دروازے کے اندرونی حصے میں دو سلیں نصب ہیں جن میں سے ایک پر کلمہ شریف اور دوسری پر مختلف قرآنی آیات کندہ ہیں۔ شیشی دروازے پر نصب سلیب پر فارسی میں قلعے کی تعمیر کا سال ۹۴۸ھ کندہ کیا گیا ہے موجودہ حالت: قلعے کے اندر مکمل شہر آباد ہے اور ایک ہائی اسکول بھی قائم ہے۔ مقامی

لوگوں نے قلعے کے پتھر اکھاڑ اکھاڑ کر مکان بنا لیے ہیں۔ قلعے کے اندر کی زمین کی فروخت منع ہے۔ اس وقت سطح زمین سے اوسط تین سو فٹ بلند ہے۔ اس وقت چند دروازوں، مغل شہنشاہ اکبر اعظم کے سسر راجا مان سنگھ کے محل اور بڑے پھانسی گھاٹ کے سوا قلعہ کا بیش تر حصہ کھنڈرات میں تبدیل ہو چکا ہے۔ شیر شاہ سوری کے بیٹے سلیم شاہ نے قلعے کے باہر کی آبادی کو قلعہ کے اندر منتقل ہونے کی اجازت دے دی تھی۔ اس آبادی کی منتقلی کے بعد جو بستی وجود میں آئی اب اسے روہتاس گاؤں کہتے ہیں۔ سلیم شاہ کا خیال تھا کہ آبادی ہونے کے باعث قلعہ موسمی اثرات اور حوادثِ زمانہ سے محفوظ رہے گا، لیکن ایسا نہ ہو سکا اور آج اپنے وقت کا یہ مضبوط ترین قلعہ بکھری ہوئی اینٹوں کی صورت اس حقیقت کا منہ بولتا ثبوت ہے کہ ثبات ایک تغیر کو ہے زمانے میں۔

قلعہ دراوڑ چولستان:

بہاولپور کا شمار بر صغیر پاک وہند کی خوشحال ریاستوں میں ہوتا تھا۔ ۱۸ ویں صدی کے اوائل سے قریباً ڈھائی صدیوں تک یہاں کے حکمران رہنے والے عباسی خاندان نے ایک طرف دارالخلافہ بہاولپور میں پُر آسائش محلات اور باغات تعمیر کیے تو دوسری طرف کالج، ہسپتال، سٹیڈیم، تفریحی مقامات اور لائبریریاں بھی بنوائیں۔

دنیا کے کسی بھی ملک سے زیادہ قلعے پاکستان کے ڈویژن بہاولپور سرزمین چولستان میں ہیں ویسے تو پاکستان میں سینکڑوں قلعے ہیں لیکن چولستان میں قلعوں کی تعداد ۲۹ ہے۔

قلعہ دراوڑ کے ساتھ ہی ایک قدیم زمانے کی پتھروں کی مسجد بنائی گئی ہے جو کہ انتہائی خوبصورت ہے اس کی دیواریں بہت موٹی اور مضبوط ہیں اس مسجد میں مختلف طرز کے پتھر لگائے گئے ہیں۔ اس مسجد کی دلچسپ بات یہ ہے کے اس کے صحن کے درمیان ایک سفید پتھر لگایا گیا ہے جو تیز دھوپ میں بھی ٹھنڈا رہتا ہے۔ قلعہ دراوڑ ہزاروں سال پرانا ہے۔ اس کو دیوراول نے تعمیر کرایا تھا اور بعد میں بہاولپور کے نواب خان اول نواب آف بہاولپور نے قبضہ کر لیا اور اس قلعے کی تعمیر مکمل کرائی۔ یہ قلعہ بہاولپور کی تحصیل احمد پور شرقیہ کے ساتھ واقع ہے۔

قلعہ دراوڑ کے نام اور تعمیر کے بارے میں مورخین کی آرا مختلف ہیں۔ کچھ مورخین کا خیال ہے کہ اس قلعہ کو نویں صدی میں رائے ججا نے تعمیر کروایا جو ایک راجپوت حکمران تھا۔ بعض مورخین کے مطابق قلعہ کو راول دیوراج بھاٹی نے تعمیر کروایا، جو جیسلمیر اور بہاولپور ریاست کا خود مختار راجپوت حکمران تھا۔ اس لیے قلعہ کو دیوراول کہا

جانے لگا۔ وقت کے ساتھ ساتھ یہ دیو راول سے دیو راور اور پھر دراوڑ بن گیا، جو اس کا موجودہ نام بھی ہے۔ یہ قلعہ جیسلمیر ریاست کا حصہ تھا۔ ۱۷۳۳ء میں نواب آف بہاولپور نواب محمد خان اول نے اس قلعہ پر حملہ کیا اور راجہ راول سنگھ کو شکست دے کر اس قلعہ پر اپنی حاکمیت قائم کی۔ یوں یہ قلعہ ریاست بہاولپور کا حصہ بن گیا۔ جیسلمیر کے راجہ راول سنگھ نے ۱۷۴۷ء میں قلعہ پر دوبارہ قبضہ جما لیا لیکن ۱۸۰۸ء میں نواب آف بہاولپور نے دوبارہ قلعہ پر حملہ کرتے ہوئے راجہ راول سنگھ کو شکست دی اور ایک بار پھر یہ قلعہ ریاست بہاولپور کا حصہ بن گیا۔ اس کے بعد سے یہ قلعہ ان کے خاندان کی حکمرانی میں رہا۔ عباسیوں نے اس کی تعمیرات میں بیش قیمت اضافہ کیا، اس میں موتی مسجد بھی شامل ہے، جسے دلی کے لال قلعہ میں واقع مسجد کے مماثل مغلیہ فن تعمیر پر بنایا گیا۔ ساتھ ہی اس قلعہ سے ایک خفیہ سرنگ بھی بنائی گئی جو نور محل سے منسلک ہوتی تھی، عباسی نوابوں کی قلعہ میں آمد و رفت کا سلسلہ یہیں سے جاری رہا۔

قلعہ دراوڑ کی ۳۰ میٹر بلند و بالا بل کھاتی مربع شکل کی دیواریں، قلعہ کے جاہ و جلال کی ایک عظیم داستان بیان کرتی ہیں۔ قلعہ دراوڑ کا آرکیٹیکچر اس ثقافتی میل ملاپ کا سنگم ہے، جو مغل اس برصغیر میں اپنے ساتھ لائے۔ مغل طرزِ تعمیر کے اس شاہکار قلعہ میں آپ کو فارس، تیموری اور ہندو طرزِ تعمیر کی مشترک خوبیاں نظر آئیں گی۔ نظری اعتبار سے اسے آپ دیوارِ سندھ رنی کوٹ سے مشابہ قلعہ قرار دے سکتے ہیں۔ صحرائے چولستان کے عین درمیان واقع اس قلعے کا طلسمی نظارہ دیکھنے والوں کو حیران کر دیتا ہے۔ اس کی سرمئی، کتھئی اور سنہری رنگت ماحول کو سحر زدہ کر دیتی ہے۔ چولستان کا یہ آئی کونک اسٹرکچر نظر انداز ہو رہا ہے۔

ہر گزرتے دن کے ساتھ اس کی دیواریں گر رہی ہیں۔ پاکستان کے ثقافتی ورثے میں عظیم مقام حاصل ہے، لیکن اس کی تعمیر نو پر ذرا بھی توجہ مرکوز نہیں کی گئی۔ قلعہ میں ۴۰ پلوں سمیت ایک کنواں، ایک مرکزی دروازہ اور ایک بڑا تالاب ہے، جو سیاحوں کی خصوصی دلچسپی کا مرکز ہے۔ تالاب اب خشک ہو چکا ہے۔ قلعہ میں موجود اکثر کمروں کی دیواریں اور چھتیں گر چکی ہیں جبکہ مرکزی دیواریں بھی کمزور پڑ چکی ہیں، جن کے کسی بھی وقت گرنے کا خدشہ ہے۔ قلعہ کے صحن نما میدان میں ایک قدیم اور تاریخی توپ بھی موجود ہے، جو جنگ کے دوران دشمنوں کے خلاف استعمال کی جاتی تھی مگر آج یہ توپ بھی تاریخ کا حصہ بن چکی ہے۔ توپ کے ساتھ ایک سرنگ بھی بنائی گئی تھی، جو قلعہ کے خفیہ راستوں سے ہوتی ہوئی جیسلمیر تک جاتی تھی، جسے بعد میں بند کر دیا گیا تھا۔

قلعہ دراوڑ میں دوسرے قلعوں کے مقابلے میں بیرونی آرائش کا زیادہ خیال رکھا گیا ہے، جو حکمرانوں کے جاہ و جلال کی عکاسی کرتا ہے کہ وہ دفاع و زیبائش کے حوالے سے کتنے حساس تھے۔ اندرونی طور پر مضبوط دفاعی قلعے کا اندازہ اس کی موٹی دیواروں اور بلند و بالا میناروں سے بخوبی لگایا جاسکتا ہے۔ اتنی صدیاں بیت جانے کے باوجود یہ قلعہ اپنی مکمل رعنائیوں کے ساتھ موجود ہے۔ بیرونی دیواروں کو پکی اینٹوں سے آراستہ کیا گیا ہے، جو اُچ شریف سے ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ تک ہاتھوں کی قطار کی صورت یہاں پہنچیں کیوں کہ اس دور میں نقل و حمل کے ذرائع ناکافی تھے۔ یہ مقامی ماہرینِ تعمیرات کی مشترکہ کاوش ہے اور یہ اپنے حاکم سے وفاداری و ایثار کی بھی زریں مثال ہے۔ قلعہ کے تمام اطراف برج نما فصیلوں کو موٹی اور پکی اینٹوں سے تعمیر کیا گیا ہے، جس سے نہ صرف قلعہ بندی ممکن ہوئی بلکہ دیکھنے والوں کے لیے بھی یہ دیواریں دلفریب منظر پیش کرتیں ہیں۔ اس کی

کل ۴۲ فصیلیں تھیں، جن پر جیو میٹری کی اشکال میں کندہ آرائشی کام اس دور کے ماہرینِ تعمیرات کے ذوق کی اعلیٰ مثال ہے۔ اس کے اندر فوجیوں اور شاہی خاندان کی رہائشیں تھیں۔

قلعہ دراوڑ کو چولستان میں داخل ہونے کا دروازہ، ”بابِ چولستان“ بھی کہا جاتا ہے۔ قلعہ دراوڑ کو پاپولر میوزک ویڈیوز میں پس منظر کے طور پر فلمایا جاچکا ہے۔

صحرائے چولستان میں ہر سال منعقدہ جیپ ریلی کے آغاز کا ابتدائی نقطہ دراوڑ قلعہ ہوتا ہے۔ یہ ریلی تین اضلاع سے گزرتی ہے، جس میں لوگوں کی بڑی تعداد شرکت کرتی ہے۔

برطانوی ادوار میں یہاں قیدیوں کو قید رکھا جاتا تھا اور یہی وہ جگہ ہے جہاں کچھ مکینوں کو پھانسی بھی دی گئی۔

روہی کے اس ریگستان میں قلعہ دراوڑ جیسے کئی اور قلعے ہیں، جو بے توجہی کا شکار ہیں۔ حیرت انگیز بات یہ ہے کہ پاکستان کے سیاحتی مقاموں میں چولستان کی پہچان قلعہ دراوڑ ہی ہے لیکن اسی کو سب سے زیادہ نظر انداز کیا جا رہا ہے، جبکہ غیر ملکی اس عظیم ورثے کی تعریف کرتے ہیں۔

لاہور قلعہ:

قلعہ جس کے لغوی معانی استحکام اور حفاظت کے ہوتے ہیں، فوجی مقاصد یا شاہی رہائش گاہ کے لیے دنیا بھر میں بنائے جاتے ہیں۔ پاکستان میں مختلف ادوار میں کئی قلعے تعمیر ہوئے۔ مثلاً روہتاس، رانی کوٹ، قلعہ اٹک، قلعہ دراوڑ اور شاہی قلعہ لاہور وغیرہ۔ دریائے

راوی کے جنوبی کنارے پر ایک محفوظ مقام کو اس قلعہ کے لیے منتخب کیا گیا، یہ دراصل ایک اونچا مصنوعی ٹیلہ تھا جو لاہور شہر کی سطح سے کافی بلند تھا۔

آپ سے اگر یہ پوچھا جائے کہ شاہی قلعہ لاہور کس نے تعمیر کروایا تھا۔ تو آپ میں سے اکثر کا جواب ہو گا۔ شہنشاہ اکبر نے۔ ویسے تو یہ بات کسی حد تک درست بھی ہے۔ لیکن ممکن ہے کہ آپ کے لئے یہ بات حیران کن ہو کہ یہ قلعہ اکبر سے سینکڑوں سال پہلے بھی موجود تھا۔ ہاں اکبر نے اس کو از سر نو تعمیر کروایا تھا۔ اور جو موجودہ حالت اس کی نظر آرہی ہے اس کو اکبر کے دور میں ہی تزئین و آرائش کروائی گئی تھی۔ گو کہ اس قلعہ کی تاریخ زمانہ ءقدیم سے جاملتی ہے لیکن اس کی از سرِ نو تعمیر مغل بادشاہ اکبر اعظم (۱۵۵۶ء تا ۱۶۰۵ء) نے کروائی جبکہ اکبر کی آنے والی نسلیں بھی اس کی تزئین و آرائش کرتی رہیں۔ لہٰذا یہ قلعہ مغلیہ فنِ تعمیر اور روایت کا ایک نہایت ہی شاندار نمونہ نظر آتا ہے۔ قلعے کے اندر واقع چند مشہور مقامات میں شیش محل، عالمگیری دروازہ، نولکھا محل اور موتی مسجد شامل ہیں۔ ۱۹۸۱ء میں یونیسکو نے اس قلعے کو شالامار باغ کے ساتھ عالمی ثقافتی ورثہ قرار دیا تھا۔

پہلے یہاں ایک کچا قلعہ ہوا کرتا تھا۔ ۱۵۶۶ء میں شہنشاہ اکبر نے اسے گرا کر اس جگہ نئے سرے سے ایک عالیشان پختہ قلعہ بنوایا، جس کی تعمیر میں رہائشی مقاصد کے ساتھ ساتھ فوجی مقاصد کو بھی مدِ نظر رکھا گیا۔ قلعہ کی لمبائی ۴۶۶ میٹر اور چوڑائی ۳۷۰ میٹر ہے۔ اس کی شکل تقریباً مستطیل ہے۔ دیواریں سرخ پختہ اینٹوں سے بنی ہوئی ہیں جن کی چنائی مٹی کے گارے سے کی گئی ہے۔ ان دیواروں پر بندوقچیوں کے لیے سوراخ ہیں، جن سے وہ

محاصرہ کرنے والی فوج پر گرم پانی اور گولیاں برساتے تھے۔ اس کے آثار مشرقی دیوار میں اب تک موجود ہیں۔

اس قلعہ کے اندر مختلف ادوار میں مختلف عمارات تعمیر ہوئیں جن کو چھ حصوں میں تقسیم کرسکتے ہیں:

۱. عہدِ اکبری کی عمارات
۲. نورالدین جہانگیر کی عمارات
۳. شاہجہاں کی تعمیر کردہ عمارات
۴. اورنگزیب عالمگیر کی عمارات
۵. سکھ دور کی عمارات

قلعہ بعہد انگریز:

اکبر نے قلعے کو بڑی حد تک پھیلایا، فارسی معماری عناصر کو شامل کیا اور اسے مغلیہ طاقت کی علامت بنایا۔ قلعے کی اسٹریٹیجک جگہ راوی دریا کے قریب تھا، جس نے اسے ایک اہم فوجی اور انتظامی مرکز بنایا۔ اکبر کی اضافوں میں عالمگیری گیٹ کی تعمیر شامل تھی، جو قلعے کا مرکزی دروازہ تھا اور اس کا مکبرہ دیکھتے وقت لوگوں پر گہرا اثر ڈالتا تھا۔

اکبر کے جانشین، جہانگیر اور شاہجہان کے دور میں قلعے کو مزید سجاوٹ ملی۔ جہانگیر نے کئی باغات اور پویلینز شامل کیے، جن میں مشہور تصویر والی دیوار شامل ہے، جو رنگین فریسکو اور ٹائل ورک سے مزین ہے، جو درباری زندگی، شکار، اور اساطیری مناظر کو

دکھاتے ہیں۔ شاہجہان، جو اپنی معماری کارنامے کے لیے مشہور ہے، جیسے کہ تاج محل، نے قلعے کی خوبصورتی میں اضافہ کیا، وہ شیش محل اور نولکھا پویلین کو شامل کیا، دونوں مغلیہ فن معماری کے شاہکار ہیں۔

قلعے کے ارد گرد ایک اونچی فصیل ہے جس کے تین بڑے دروازے ہیں، ایک مشرق کی سمت، دوسرا جنوب کی سمت، اور تیسرا شمال مغرب کی جانب ہے۔ شمال مغربی دروازے سے بادشاہ اور بیگمات ہاتھی پر سوار ہو کر گزرتے تھے، اس دروازے پر شاہ جہاں کا نام بھی کندہ ہے۔ یہ دروازہ انگریزوں کے حکم پر بند کر دیا گیا تھا مگر ۲۰ نومبر ۱۹۴۹ء کو سابق گورنر پنجاب نے پورے تین سو سال بعد اسے دوبارہ کھلوا دیا۔ قلعے کے اندر ایک دیوان ہے جس کی چھت ستونوں کے سہارے کھڑی ہے، اسے دیوان عام کہتے ہیں۔ اس میں ایک جھروکا بنا ہوا ہے جہاں بیٹھ کر شاہ جہان رعایا کو اپنا دیدار کراتا تھا۔ اورنگزیب، آخری عظیم مغلیہ حکمران، نے قلعے کے قریب بادشاہی مسجد تعمیر کی، جو دنیا کی بڑی مساجد میں سے ایک ہے۔ اس اضافے نے قلعے کی مذہبی اہمیت اور معماری دیدوسحر کو بڑھاوا دیا۔ مسجد کا بڑا میدان اور عمدہ ڈیزائن، مغلیہ معماری عروج کی دلیل ہے مغلیہ سلطنت کے زوال کے بعد، شاہی قلعہ انیسویں صدی کے اوائل میں سکھ سلطنت کے قبضے میں آیا۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ نے قلعے کو اپنی رہائشگاہ کے طور پر استعمال کیا اور کئی تبدیلیاں کیں، جن میں سکھ انداز کا محل، خاراسنگھ حویلی شامل ہیں۔ برطانوی نو آبادیاتی دور میں، قلعے کا فوجی مقاصد کے لیے استعمال کیا گیا، اور اس کی ساخت میں چند تبدیلیاں کی گئیں، لیکن ان کا اثر نسبتاً معمولی تھا۔

دیوان خاص بادشاہ کا شاہی دربار تھا، جہاں وہ اپنے وزیروں مشیروں، شہزادوں اور دوسرے راجائوں مہاراجوں سے ملاقات کیا کرتا تھا اور سلطنت کے بارے میں صلاح مشورہ لیتا تھا۔ قلعے کے اندر ایک شیش محل ہے جو فن تعمیر اور فن نقاشی کا بہترین نمونہ ہے، اس کی دیواریں اور چھتیں رنگ برنگے شیشوں اور پچی کاری کے کام سے مزین ہیں، ان کی چمک دمک آنکھوں کو چندھیا دیتی ہے۔ اب بھی شیش محل کے کسی کمرے میں دیا سلائی روشن کی جائے تو تمام کمرہ جھلمل کرنے لگتا ہے، کہتے ہیں کہ اسے شاہ جہاں نے تعمیر کروایا تھا۔

شیش محل کے قریب ہی موتی مسجد ہے، یہ بھی فن تعمیر کا ایک دلکش نمونہ ہے، اسے جہانگیر نے شاہی بیگمات کے لیے تعمیر کروایا تھا تاکہ وہ اس مسجد میں باپردہ نماز ادا کر سکیں۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ نے اپنے دورِ حکومت میں اس قلعہ پر قبضہ کیا تو اس نے موتی مسجد کا نام بدل کر "موتی مندر" رکھ دیا تھا، اگرچہ سکھوں نے مسجد سے قیمتی ہیرے جواہرات نکال کر اس کی خوبصورتی کو سخت نقصان پہنچایا لیکن اس کے باوجود اس کی عظمت کو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکے۔

قلعے کے اندر ایک چھوٹا سا میوزیم بھی ہے جس میں بہت سی نادر اشیاء محفوظ ہیں، بہت سی الماریوں میں پرانے زمانے کے اوزار، اسلحہ، تصویریں اور لباس وغیرہ بڑے قرینے سے سجائے گئے ہیں۔ اتنی مدت گذر جانے کے باوجود بھی ان چیزوں کی سج دھج اور شان و شوکت میں کوئی فرق نہیں آیا۔

شاہی قلعے کے جنوب مغرب کی طرف ایک وسیع علاقہ ہے جہاں پر عہدِ مغلیہ میں شاہی باورچی خانہ و اصطبل تھا۔ یہ جگہ لوہ کے مندر کی پچھلی جانب اور مثمن دروازہ کی جنوبی طرف واقع ہے۔ یہ باورچی خانہ ایک بہت بڑے ہال اور چھوٹے چھوٹے کمروں پر مشتمل تھا جس کے کئی دروازے تھے۔ اس میں کئی ایک انواع کے کھانے تیار ہوتے جو کہ شاہی دستر خوان کی زینت بنتے تھے جبکہ شاہی اصطبل میں اچھی نسل کے گھوڑے رکھے جاتے تھے۔

برطانوی عہد میں اس شاہی باورچی خانہ اور اصطبل کی حیثیت کو ختم کر کے یہاں پر پولیس کی بارکیں بنادی گئیں اور کچھ اضافی عمارات بنا کر اس کو جیل میں تبدیل کر دیا گیا اور کچھ عرصہ تک یہ جیل زیر استعمال رہی۔

عہدِ اکبری کے دولت خانہ خاص و عام کی جنوبی دیوار سے متصل دیوان عام جو آصف خان کی زیرِ نگرانی شاہجہاں کے حکم پر ۱۶۳۱-۳۲ء میں پایہ تکمیل کو پہنچا۔ جو کہ مستی دروازہ کے مغرب میں واقع ہے۔ یہ سنگِ سرخ کے چالیس ستونوں پر مشتمل خوبصورت عمارت ہے جس کو اونچے چبوترے پر بنایا گیا ہے۔ جس کی تین اطراف میں سنگِ سرخ کی جھالر / کٹہرا بنا ہوا ہے اور ہر طرف سے راستہ چبوترے پر جاتا ہے۔ جس سے امراء، وزراء اور دیگر ملازمین دیوان میں داخل ہوتے تھے۔

سکھ دور حکومت ۱۸۴۱ء میں اس دیوان کے حسن کو کافی نقصان پہنچا جس کی وجہ سکھوں کی باہمی چپقلش اور لڑائی تھی چنانچہ اسی وجہ سے سکھ سردار شیر سنگھ نے قلعہ پر بادشاہی مسجد کے میناروں سے گولہ باری کی جس سے اس کا کافی حصہ گر گیا جس کی بعد

میں انگریزوں نے مرمت کر کے اس دیوان کو ہسپتال کی حیثیت دے دی اور کافی عرصہ یہ عمارت بطور ہسپتال استعمال ہوتی رہی۔ آخر ۱۹۲۷ء کو محکمہ آثارِ قدیمہ نے اسے اپنی تحویل میں لے کر اصلی صورت بخشی۔

دیوان عام میں سے ایک زینہ جھروکہ درشن میں جاتا ہے۔ اس جھروکے کے پیچھے اکبری عہد کے دولت خانہ خاص و عام کی عمارت ہے یہ ایک دو منزلہ عمارت چار گوشہ عمارت، دولت خانہ خاص و عام، اکبری محل کے نام سے مشہور ہے۔ جو اکبر کے حکم پر ۱۵۸۷ء کو تعمیر ہونا شروع ہوئی اور سن ----۱۸۔۱۶۱۷ء میں عہد جہانگیری میں پایہ تکمیل کو پہنچی۔ اس پر سات لاکھ روپیہ خرچ ہوا۔ وسیع علاقے پر مشتمل یہ محل ۱۱۶ کمروں پر مشتمل تھا جس کا کافی حصہ بالکل ختم ہو چکا ہے صرف بنیادوں کے آثار باقی ہیں۔

اس وقت جو حصہ بچا ہوا ہے اس میں دولت خانہ خاص، جھروکہ اور کچھ رہائشی کمرے ہیں۔ دولت خانہ چار کمروں پر مشتمل ہے۔ جن میں ایک مستطیل، ایک ہشت پہلو اور دو شش پہلو ہیں جب کہ ان کی شمال اور مغربی جانب برآمدے ہیں جن میں دوہرے سنگ مرمر کے ستون ہیں جبکہ دیواروں اور چھتوں کو چونے کی رنگین گلکاری اور منبت کاری سے سجایا گیا ہے۔

دولت خانہ خاص و عام کی مشرقی جانب اور احاطہ جہانگیری کے جنوب مشرقی جانب ایک دو منزلہ عمارت ہے اس عمارت کا زیریں حصہ عہدِ اکبری کا ہے۔ جبکہ اوپر والی عمارت راجہ رنجیت سنگھ نے اپنے بیٹے کھڑک سنگھ کے لیے بنوائی۔ اسی لیے یہ کھڑک سنگھ کی حویلی کے نام سے مشہور ہے۔ کھڑک سنگھ کا یہ محل آٹھ کمروں اور ایک بڑے ہال پر

مشتمل تھا جس کی چھت لکڑی اور دیواروں پر چونے کا پلستر کیا گیا تھا۔ جو اپنی خوبصورتی کے لحاظ سے ایک اعلیٰ نمونہ تھا۔ آج کل عمارت کے اس حصے میں ڈائریکٹر حلقہ شمالی آثارِ قدیمہ کا دفتر ہے۔ جہانگیر کی والدہ مریم زمانی نے ۱۶۱۴ء کو قلعہ کے مشرقی دروازے کے باہر ایک عظیم الشان مسجد تعمیر کروائی جو اسی کے نام سے موسوم ہوئی۔ قلعے کا یہ دروازہ مسجد کے قریب ہونے کی وجہ سے ”مسجدی دروازہ“ کہلایا جو بعد میں بگڑ کر ”مستی“ دروازہ بن گیا۔ یہ دروازہ قلعہ کی مشرقی دیوار کے وسط میں واقع ہے جو ایک مضبوط اور پائیدار دروازہ ہے۔ جو اپنی خوبصورتی اور جاہ و جلال بکھیرے عہدِ اکبری کے عظیم فنِ تعمیر کی عکاسی کرتا ہے۔

مستی دروازہ ۱۵۶۶ء میں تعمیر ہوا جس کے دونوں جانب مثمن برج ہیں اور مدافعت کے لیے دندانے دار فصیل ہے جن میں مستطیل سوراخ ہیں۔ اس قسم کی سوراخ دار فصیل قلعے کے کسی اور حصے میں نہیں ملتی۔ اس دروازے کا اندرونی حصہ گنبد نما ہے جن کے دونوں جانب بڑے بڑے دو منزلہ کمرے ہیں۔ یہ کمرے محافظوں کے لیے مخصوص تھے۔ اس دروازے کے اندرونی جانب شمال اور بجانب جنوب عہدِ اکبری کی عمارات منسلک تھیں جو اب ختم ہو چکی ہیں اور اب صرف ان کی بنیادیں ہی باقی ہیں۔ اکبر کی وفات کے بعد جہانگیر (۱۶۰۵۔۱۶۲۷ء) نے عنانِ حکومت سنبھالی تو اس کے خلاف بے شمار شورشیں اٹھ کھڑی ہوئیں یہاں تک کہ اس کے بیٹے خسرو نے باپ کے خلاف بغاوت کر دی اور قلعہ لاہور کا محاصرہ کر لیا مگر صوبے دار لاہور دلاور خان نے اس کی ایک نہ چلنے دی تو اس نے راہِ فرار اختیار کی۔ دریں اثنا خسرو اپنے سات سو ساتھیوں کے ساتھ دریائے چناب کے قریب پکڑا گیا۔ اسی دوران جہانگیر لاہور آیا اور تقریباً ایک سال تک یہیں شاہی

قلعے میں قیام کیا اور اپنے باپ کے نقش قدم پر چلتے ہوئے شاہی قلعہ لاہور میں نہایت عمدہ عمارات تعمیر کروائیں اور ساتھ ساتھ ان عمارات کی تکمیل بھی کروائی جن کی بنیادیں اس کے باپ اکبر نے رکھی تھی۔

دیوانِ عام کی شمالی جانب ایک وسیع اور خوبصورت سبزہ زار ہے مغلیہ طرز کا یہ باغ برطانوی دورِ حکومت میں ختم کر دیا گیا اور یہاں ٹینس کھیلنے کے لیے جگہ بنا دی گئی جسے بعد میں دوبارہ اصل حالت میں تعمیر کیا گیا۔

مالوٹ قلعہ چکوال:

سطح مرتفع پوٹھوہار میں جا بجا مختلف قلعوں اور مندروں کے آثار / کھنڈرات بکھرے ہوئے ہیں جن میں سے کچھ تو بہتر حالت میں ہیں جبکہ کچھ آخری سانسیں لے رہے ہیں۔ ان میں سے ایک ملوٹ کا قلعہ اور مندر بھی ہے۔

ملوٹ، پاکستان کے صوبہ پنجاب کے ضلع چکوال کا ایک گاؤں ہے۔ یہ چکوال شہر سے ۴۰ کلو میٹر اور کلر کہار سے ۱۲ کلو میٹر کے فاصلے پر مغرب میں واقع ہے۔ یہاں جاتے ہوئے جپسم پتھر کی پہاڑیاں نظر آتی ہیں جبکہ کٹاس راج اور کھیوڑہ کی کانوں کو بھی دیکھا جاسکتا ہے۔ راجپوتوں کی تاریخ کے مطابق ملوٹ نام ‘ملک-کوٹ’ کی بگڑی ہوئی شکل ہے۔

ان کا ماننا تھا کہ ملک کا لقب اس کو دیا جاتا تھا جس نے دہلی کے مسلمان بادشاہ سے الحاق قبول کیا، جس کے بدلے میں ملک کو تفویض کردہ علاقے میں مکمل خود مختاری حاصل تھی۔ مغل بادشاہ ظہیر الدین بابر بابر کا سفرنامہ ‘تزک بابری’ بھی ملک-کوٹ، مل-کوٹ اور پھر ملوٹ کی تصدیق کرتا ہے۔ ایک روایت کے مطابق جنجوعہ راجپوتوں کے ایک مورث اعلیٰ کے نام ‘ملو’ پر یہ نام پڑا۔ جنجوعہ روایات کہتی ہیں کہ اس کا نام ان کے مورث اعلیٰ "راجہ مل دی" یا ملو کی نسبت سے ملوٹ پڑا جو بعد میں مسلمان ہو گیا تھا۔

قلعہ اب ڈھونڈنے سے بھی نہیں ملتا البتہ ملوٹ قلعے کے مندروں کی بناوٹ کی بات کریں تو اس کی ہو بہو نقل وادی نیلم میں شاردہ کا مندر ہے جسے قدیم درسگاہ بھی کہا جاتا ہے۔ قدیم یونانی اور کشمیری ہندو فن تعمیر کے حامل یہ مندر سطح سمندر سے لگ بھگ تین ہزار دو سو ۳۲۰۰ فٹ بلند ہیں۔ یہاں دو انگلی نما چٹانیں ہیں جو ہزاروں فٹ نیچے سے آرہی ہیں، غالباً یہ کبھی سرچ ٹاور ہوا کرتی تھیں۔

سالٹ رینج میں جنجوعہ حکمران غیر ملکی حملہ آوروں کا نشانہ ہوتے تھے کیونکہ دہلی پر حملہ آور ہونے کے لیے پہلے یہاں حملہ کیا جاتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ قلعہ کی تعمیر کے سال

کے حوالے سے متضاد آراء پائی جاتی ہیں۔ ایک روایت کے مطابق کہا جاتا ہے کہ یہ قلعہ ۹۸۰ء میں تعمیر کیا گیا تھا، جس پر ۱۰۰۵ء میں محمود غزنوی نے حملہ کر کے اپنے زیرِ انتظام کر لیا۔ مگر بعد میں جنجوعہ شہنشاہ راجہ مال خان نے طاقت حاصل کرنے کے بعد دوبارہ قبضہ کر لیا۔

دوسری رائے کے مطابق یہ قلعہ راجہ مال خان نے تعمیر کروایا تھا۔ راجہ مال خان کے بارے میں بتایا جاتا ہے کہ وہ ایک ہندو راجپوت تھا، تاہم شہاب الدین غوری کے ۱۱۷۸ء میں ہندوستان پر حملہ اور فتوحات حاصل کرنے کے بعد اس نے اپنے کچھ بیٹوں سمیت اسلام قبول کر لیا تھا۔ مغل شہنشاہ ظہیر الدین بابر نے ۱۵۲۶ء تا ۱۵۳۰ء تک جاری رہنے والی لڑائی میں دولت خان لودھی سے یہیں پر ہتھیار ڈلوائے تھے۔

یہاں تعمیر کیے گئے دونوں مندر کچھ حد تک بچے ہوئے ہیں۔ یہ مندر تقریباً ۶ سے ۷ فٹ اونچے چبوترے پر تعمیر کیے گئے ہیں۔ چاروں کونوں پر پتھروں کو تراش کر مینار تعمیر کیے گئے ہیں۔ مندروں کی دیواروں پر سرخ ریتلے پتھروں میں یونانی طرز کی مورتیاں کھدی ہوئی ہیں۔ ان کے نیچے شیر اور دوسرے جانوروں کی شکلیں بنائی گئی ہیں، جو فن سنگ تراشی کا بہترین نمونہ اور کشمیری اسلوب کو ظاہر کرتی ہیں۔ اس کام میں ریتلا پتھر استعمال ہوا ہے، جو موسمی اثرات سے متاثر ہوتا ہے، یہی وجہ ہے کہ سنگ تراشی کے یہ نمونے وقت کے ساتھ ساتھ ختم ہو رہے ہیں۔

مندر، اندر کی طرف ۸۱ مربع فٹ ہے۔ ملوٹ قلعہ کو ۱۸۶۰ء کی دہائی میں جیولوجیکل سروے آف انڈیا کے دوران دریافت کیا گیا تھا۔ سر الیگزینڈر کننگھم نے سالٹ

رینج میں آثار قدیمہ کے مقامات کے سروے کے دوران ملوٹ قلعے کے سامنے والے حصے کو ”حیرت انگیز طور پر جرأت مندانہ اور دلکش“ قرار دیا تھا۔ انہوں نے کہا کہ ”محراب کی اونچائی اور کونوں پر چوکور ستونوں کی وسعت عمارت کا وقار ظاہر کرتی ہے، جسے اس کے نیم دائرہ نما ستونوں نے بہت زیادہ بڑھایا ہے“۔ مقامی لوگوں کا کہنا ہے کہ ان قدیم عمارتوں اور مندروں کے نیچے قیمتی خزانے دفن ہیں۔

ملوٹ قلعے تک پہنچنا زیادہ مشکل نہیں ہے۔ اسلام آباد یا لاہور سے براستہ موٹروے کلرکہار انٹرچینج پہ اتریں اور چوآسیدن شاہ روڈ کی طرف مڑ جائیں۔ اس روڈ پہ کچھ آگے جلیبی چوک سے دائیں جانب ایک راستہ مڑتا ہے جو ملوٹ گاؤں کو جاتا ہے۔ گاؤں پہنچ کے آپ نے اس سے آگے سفر جاری رکھنا ہے۔

ایک اچھی بات یہ ہے کہ محکمہ سیاحت کی جانب سے جگہ جگہ ملوٹ مندر کے نام کے بورڈ لگائے گئے ہیں جن سے راستہ ڈھونڈنا آسان ہو جاتا ہے۔

پرانی آبادی کا پہلا ثبوت یہاں کائی سے بھرے سبزی مائل تالاب اور اس کے کنارے کھڑا قدیم برگد کا پیڑ تھا۔ اس کے بعد قلعہ کے داخلی دروازے کی طرف عمودی چڑھائی آتی ہے، جو اب صرف دو خستہ حال ٹاور ہیں۔ اگرچہ یہ سڑک کچھ تنگ ہے لیکن بائیک اور کار آرام سے پہنچ جاتی ہے۔

یہاں جانے کا بہترین موسم اکتوبر سے اپریل ہے لیکن اونچائی پہ ہونے کی بدولت مئی جون میں وقتاً فوقتاً بھی ہوا چلتی رہتی ہے۔ آس پاس کھانے پینے کی کوئی جگہ نہیں ہے سو اپنا کھانا، پانی ساتھ لے کے جائیں البتہ بیٹھنے کے لیے سائے دار جگہ موجود ہے۔

ان کھنڈرات کے بالکل قریب ماضی میں ہونے والی کوئلے کی کان کنی اور سیمنٹ کے کارخانوں نے اس قدیم ورثے کو اچھا خاصا نقصان پہنچایا ہے۔ اگرچہ پنجاب حکومت کے سیاحتی محکمے ٹی ڈی سی پی نے گزشتہ سال یہاں بہتری کے لیے کام کروایا ہے لیکن اب وقت آگیا ہے کے حکومت پاکستان کو کوہستان نمک کے تمام بقیہ مندروں، قلعوں اور دیگر آثار قدیمہ کو ”عالمی ثقافتی ورثے“ کی فہرست میں شامل کروانے کی سنجیدہ کوشش کرنی چاہیے تاکہ ہندومت وبدھ مت سے جڑی ان یادگاروں کو آنے والی نسل کے لیے محفوظ کیا جاسکے۔

قلعہ پھروالہ:

پوٹھوہار کے علاقے میں موجود قلعہ پھروالہ کی گکھڑ قبیلے کا قدیم ترین ثقافتی ورثہ ہونے کی وجہ سے ایک تاریخی حیثیت رہی ہے۔ چار مربع کلومیٹر رقبے پر محیط یہ قلعہ اسلام آباد سے مشرق کی جانب ۳۰ کلومیٹر اور تحصیل کہوٹہ کے سنگم پر واقع ہے۔ اسلام آباد سے قلعہ کی مسافت تقریباً سوا گھنٹے ہے۔ ایک جانب دریائے سواں اور دوسری طرف ہمالیہ کا پہاڑی سلسلہ ہونے کی وجہ سے اسے محفوظ مقام سمجھا جاتا تھا، تاہم، موسمی تغیرات، شکست و ریخت اور مختلف ادوار میں حکومتوں اور وزارت ثقافت و محکمہ آثار قدیمہ کی عدم توجہی کے باعث یہ قلعہ ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو گیا۔ اس کی بیشتر دیواریں اور دروازے مکمل طور پر منہدم ہو چکے ہیں اور اب محض ایک خستہ حال دروازہ اور چند دیواروں کے آثار باقی رہ گئے ہیں۔ بچ جانے والی دیواروں کی اُونچائی ۲۸ سے ۳۰ فٹ اور چوڑائی ۱۰ فٹ ہے۔ قلعہ

پھروالہ کی فصیل اونچے نیچے پہاڑوں پر کس شان سے دُور دُور تک پھیلی ہوئی ہے، جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اپنے محلِ وقوع کے اعتبار سے یہ قلعہ ناقابل تسخیر قلعوں میں سے ایک ہوگا۔

مورخین کے مطابق گکھڑوں کے سلطان کیگوہر خان نے دفاعی ضروریات کے پیش نظر ۱۱ویں صدی کے آغاز میں پھروالہ قلعہ کا سنگ بنیاد رکھا اور یہ گکھڑوں کا دارالخلافہ بھی رہا۔ اس کے ۶ دروازے تھے، جنہیں ہاتھی دروازہ، لشکری دروازہ، باغ دروازہ، قلعہ دروازہ، زیارت دروازہ اور بیگم دروازہ کے نام سے پکارا جاتا تھا۔ اس کا مرکزی لشکری دروازہ دریا کی سمت بنایا گیا تھا، جس کی اونچائی ۲۶ فٹ اور چوڑائی ۱۴ فٹ رکھی گئی تھی۔ ہاتھی دروازہ شمال مشرق جانب جبکہ بیگم دروازہ جنوب مغرب کی طرف کھلتا تھا جو کہ بری طرح تباہ ہوچکے ہیں۔

قلعہ کی حفاظت کے لیے چیک پوسٹیں بھی بنائی گئی تھیں۔ کہا جاتا ہے کہ دفاعی حکمت عملی کے تحت قلعہ میں ہر وقت گکھڑوں کے ۵۰۰ پیادہ فوجی، ۵۰ ہاتھی اور ۱۰۰ گھوڑے موجود رہتے تھے۔ قلعے کے اندر گکھڑ قبیلے کے آخری سلطان مقرب خان کا مقبرہ بھی موجود ہے۔ اس کے علاوہ قلعے کی عقبی دیوار کے ساتھ شمال کی جانب برگد کا ایک درخت ہے جس کے نیچے چند پرانی قبریں بھی موجود ہیں۔ یہاں ایک قدیم مسجد کے آثار بھی نظر آتے ہیں۔

کہتے ہیں کہ گکھڑ قبیلہ پنجاب میں ۶۸۲ء سے آباد ہے۔ مستند تاریخ میں محمود غزنوی اور پرتھوی راج کی ۱۰۰۸ء میں لڑی جانے والی لڑائی کا ذکر ہے جو کہ اٹک میں چھچھ

کے مقام پر لڑی گئی۔ سلطان محمود غزنوی نے واپس جاتے ہوئے غالباً فتح کی خوشی میں دریائے سندھ اور جہلم کا درمیانی علاقہ، جو جنگی حوالے سے انتہائی اہم تھا، کو گوہر خان کو سونپ دیا۔ اس کے علاوہ علاؤالدین خلجی نے قلعہ پھروالہ کو اپنی سرحدی فوج کا ہیڈ کوارٹر قرار دیا تھا۔ فیروز شاہ تغلق نے بھی قلعہ پھروالہ میں قیام کیا۔ مغل بادشاہ ظہیر الدین بابر جب ۱۵۱۹ء میں ہندوستان پر حملہ آور ہوا تو ان دنوں پوٹھوہار کا علاقہ دو حصوں میں تقسیم تھا۔

ایک علاقے پر تاتار خان (اس کا صدر مقام پھروالہ قلعہ تھا) اور دوسرے حصے یعنی کوہستانی علاقے پر اس کا چچازاد ہاتھی خان حکمران تھا۔ بابر کے بھرہ میں قیام کے دوران ہاتھی خان نے تاتار خان کو قتل کر کے اس کا علاقہ ہتھیا لیا تھا۔ جب بابر کو اس واقعے کی اطلاع اور ہاتھی خان کی مسافروں کو لوٹنے کی شکایات موصول ہوئیں تو اس نے قلعہ پھروالہ کا محاصرہ کر لیا۔ سخت لڑائی کے بعد بابر کو فتح ملی تو ہاتھی خان قلعہ سے فرار ہو گیا۔ بعد ازاں ہاتھی خان کی صلح نامے کی درخواست پر بابر نے اسے معاف کر دیا اور اسے سلطان کے لقب سے نوازا۔ یہیں سے مغلوں اور گکھڑوں کی دوستی شروع ہوئی۔

سن ۱۵۲۵ء میں ہاتھی خان کی موت کے بعد تاتار خان کا بیٹا سلطان سارنگ خان حاکم بنا۔ شیر شاہ سوری سے شکست کے بعد مغل بادشاہ ہمایوں نے جب شاہ ایران کی فوجی مدد سے ہندوستان کا دوبارہ رُخ کیا تو اس نے دریائے سندھ کو عبور کر کے قلعہ پھروالہ میں قیام کیا تھا۔ یہاں اس کے ساتھ شہزادہ اکبر بھی تھا۔ گکھڑوں نے ہمایوں کو اپنی کھوئی ہوئی سلطنت واپس دلانے میں بھرپور مدد کی۔

اس کے بعد جب اکبر بادشاہ بنا تو اس نے سلطان سارنگ خان کے بیٹے سلطان کمال خان کو پوٹھوہار کا علاقہ دینے کے ساتھ اسے مغل فوج میں پنج ہزاری کا خطاب دیا۔ مغلوں اور گکھڑوں کی قربت کا اندازہ ان کی آپس میں شادیوں سے بھی کیا جا سکتا ہے۔ سلطان سارنگ خان کی پوتی جہانگیر سے بیاہی گئی۔ علی قلی خان کی بیٹی اورنگزیب کے چوتھے بیٹے شہزادہ اکبر کے عقد میں آئی۔

گکھڑوں کے آخری سلطان مقرب خان نے مغرب میں یوسفزئی افغانوں اور قلی خان رئیس خٹک کو شکست دے کر اپنی ریاست سندھ سے چناب تک پھیلا دی۔ بعد ازاں، ۱۸۲۵ء میں سکھوں کی بڑھتی ہوئی طاقت کے آگے مقرب خان نہ ٹھہر سکا۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ کے دور میں سکھوں نے قلعہ پھروالہ پر قبضہ کرکے اسے کھنڈر بنا دیا اور یوں پوٹھوہار پر گکھڑوں کے ۷۵۰ سالہ دورِ اقتدار کا خاتمہ ہوگیا۔ پھروالہ کا قلعہ پوٹھوہار کی ایک پوری تاریخ کا گواہ ہے۔ اس قلعے کو ۱۹۵۵ء میں محکمہ آثارِ قدیمہ کے سپرد کیا گیا۔ آجکل یونیسکو کے تعاون سے اس تاریخی قلعے کی بحالی کا کام جاری ہے۔

قلعہ پھروالا' کو یہ سعادت بھی نصیب ہوئی کہ ممتاز صوفی بزرگ حضرت داتا گنج بخشؒ اور حضرت قطب شاہؒ نے اپنے قیام سے اس جگہ کو منور کیا۔ ۱۰۱۸ء میں ممتاز حساب دان اور ماہر فلکیات ابوالفتح البیرونی نے قلعہ میں قیام کیا اور ملحقہ پہاڑیوں سے زمین کا قطر ناپا۔ ۱۲۰۰ء میں شہاب الدین غورنے پر تھوی راج کو شکست دینے کے بعد دہلی پر قبضہ کر لیا۔ دہلی سے واپسی پر جب وہ ۴۰۰ اونٹ خزانے کے ساتھ گکھڑوں کے علاقے سے گزرا تو فدائی جان گکھڑ نے ۲۰ کمانڈوز کے ساتھ شب خون مار کر شہاب الدین غوری کو شہید کر ڈالا۔ غوری کے داماد قطب الدین ایبک نے "قلعہ پھروالا" پر حملہ کرکے گکھڑوں سے بدلہ

لیا۔ سن ۱۵۲۴ میں سلطان ظہیر الدین بابر نے "قلعہ پھروالا'' پر حملہ کیا جس کا ذکر "تزک بابری'' میں تفصیلاً کیا گیا ہے۔ قلعے پر قبضے کے بعد بابر نے تاتار محل میں قیام کیا۔ بالآخر بابر اور گکھڑوں میں صلح ہو گئی اور یہاں سے مغلوں اور گکھڑوں میں ایسے لازوال اور برادرانہ تعلقات کا آغاز ہوا جو آخر دم تک قائم رہا

قلعہ شیخوپورہ:

قلعہ شیخوپورہ، ٦۴ کنال پر محیط، مغلیہ دور کی شان و شوکت کی علامت ہے۔ روایتی طور پر کہا جاتا ہے کہ اسے شہنشاہ جہانگیر نے تعمیر کروایا تھا لیکن اس کا کوئی حتمی ثبوت نہیں ہے۔ غالباً اس کی وجہ قلعہ کا جہانگیر کے تعمیر کردہ ہرن مینار اور شکار گاہ کے نزدیک ہونا ہے۔

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ١٦٠٦ء میں شہنشاہ جہانگیر نے جہانگیر پورہ (موجودہ شیخوپورہ) میں پڑاؤ ڈالا جو اس کی شکار گاہ تھی۔ جہانگیر نے اپنے ایک مشّاق شکاری سکندر امین کو وہاں ایک قلعہ تعمیر کرنے کا حکم دیا، جس کا نام شہنشاہ کے نام سے ماخوذ تھا۔

ماہرین کا خیال ہے کہ یہ کوئی روایتی قلعہ نہیں بلکہ شہنشاہ جہانگیر کی رہائش گاہ تھی۔ ’تزک جہانگیری‘ کے مطابق یہ قلعہ نما محل ۱۶۰۷ء میں تعمیر کیا گیا تھا، جو کسی دفاعی مقصد کے تحت نہیں بلکہ شکار کے لیے آنے والے شہنشاہ جہانگیر کی رہائش کے طور پر بنایا گیا تھا، وہ اپنے ساتھیوں اور فوج کے ساتھ یہاں قیام کرتے تھے۔ قلعہ یقینی طور پر کم از کم ابتدائی مغلیہ دور یا اس سے قبل کا ہے، جس کی ساخت میں مختلف ادوار میں بہت سی تبدیلیاں کی گئیں۔ ۱۶۴۶ء کے بعد یہ علاقہ مختصر عرصے کے لیے شاہ جہاں کے بیٹے شہزادہ داراشکوہ کے پاس رہا اور ممکنہ طور پر ایک کیمپ کے طور پر استعمال ہوا۔

چونسٹھ کنال سے زائد رقبے پر محیط یہ قلعہ شیخوپورہ شہر کے جنوب مشرقی کونے میں ایک اونچے ٹیلے پر واقع ہے۔ مربع شکل میں مغلیہ طرز پر تعمیر کردہ اس قلعے کی پیمائش شمال سے جنوب کی جانب یعنی لمبائی ۱۲۵ میٹر (۴۱۰ فٹ) اور مشرق سے مغرب تک یعنی چوڑائی ۱۳۵ میٹر (۴۴۴ فٹ) ہے۔ پکی اینٹوں سے بنی اس کی فصیل کی اوسط اونچائی تقریباً ۳۸ فٹ جبکہ چوڑائی ۲۲ فٹ ہے۔

قلعہ کا بیرونی دروازہ مضبوطی و پائیداری میں بے مثال ہے، جس کے ساتھ ہی دونوں جانب برج موجود ہیں۔ مشرق کی طرف بنی ہوئی کھڑکیوں میں پتھر کی جالی لگی ہے جبکہ ڈیوڑھی سے اندر جانے کے لیے دائیں اور بائیں جانب دو دروازے ہیں۔ ڈیوڑھی سے آگے بڑھیں تو ۱۴ فٹ چوڑا راستہ ہے، جس پر چھوٹی چھوٹی اینٹوں کی سولنگ لگی ہوئی ہے۔ اس کے مغربی کنارے پر ملازمین کے تقریباً ۶ کمرے بنے ہوئے ہیں۔

ڈیوڑھی کے بائیں دروازے سے جائیں تو وہاں ایک کنواں موجود ہے، جسے قلعے میں آنے والے قافلوں اور جانوروں کی پانی کی ضروریات پوری کرنے کے لیے بنایا گیا تھا۔ اب تک اصل حالت میں موجود اس کنوئیں کی گہرائی ۵۸ فٹ اور قطر آٹھ فٹ ہے۔ قلعے میں ڈھلوان کی طرف بنے راستے سے جنوبی دیوار کے ساتھ ساتھ دوسری منزل اور جنوب مغربی برج کی طرف پہنچا جاسکتا ہے۔ کسی زمانے میں اس برج کے ساتھ محافظوں اور سپاہیوں کے کمرے ہوا کرتے تھے مگر آج صرف ان کی دیواروں کے نشان اور چھت باقی ہے۔

قلعہ کے شمال مشرقی حصے میں اس دور کے باقی ماندہ تباہ شدہ ہالز اور تہہ خانے ہیں، جنہیں جہانگیر اور شاہ جہاں نے شاہی رہائش گاہ کے طور پر استعمال کیا ہو گا۔ تہہ خانوں کی چوڑائی ۱۰ فٹ ہے، اس کی چھتیں ڈاٹ دار اور گنبد نما ہیں، جو اس وقت بھی اچھی حالت میں ہیں جبکہ روشنی اور ہوا کے لیے جنوبی دیوار میں گیارہ کھڑکیاں بنائی گئی ہیں۔ قلعہ کے شمال مشرقی کونے میں بالائی منزل پر ایک کمرہ ہے، جس کے اندرونی حصے کو مختلف نمونوں میں پھولوں کی فریسکو پینٹنگز سے بھرپور طریقے سے سجایا گیا ہے۔

دیواروں پر حسین و منقش تصاویر جابجا نظر آتی ہیں، ان پر فارسی زبان میں اشعار کی خطاطی دل کو بہت بھاتی ہے۔ دیواروں پر ان نفیس و نازک نقوش کو دیکھ کر عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ قلعے کے اندر سب سے زیادہ متاثر کن عمارتیں اس کی شاندار کوٹھیاں ہیں جو زیادہ تر سکھ دور اور بعد کے مغل دور (۱۷ویں صدی کے وسط سے ۱۹ویں صدی کے اوائل تک) میں تعمیر کی گئی تھیں۔ لیکن ان کی تعمیر میں بنیادوں کی مضبوطی کو مد نظر نہیں رکھا گیا، جس کی وجہ سے زیادہ تر عمارت گر چکی ہے۔

ان کوٹھیوں میں سکھ سلطنت کے مہاراجہ رنجیت سنگھ کی بیوی مہارانی دتار کور بھی مقیم رہی۔ سکھ سیاست میں فعال کردار ادا کرنے والی رنجیت سنگھ کی مشہور ملکہ مہارانی جند کور کو انگریزوں نے سکھ راج کے زوال کے بعد اسی قلعے میں قید رکھا۔

یہ قلعہ سکھوں اور انگریزوں کے دور میں فوجی اڈے کے طور پر بھی استعمال ہوا۔ قیامِ پاکستان کے بعد یہاں مہاجر کیمپ بھی قائم کیا گیا۔ اس کے علاوہ یہاں کئی سرکاری دفاتر بنائے گئے، جس کی وجہ سے عمارت کی اصل تاریخی شکل کو شدید نقصان پہنچا۔ ۱۹۶۴ء میں اس قلعے کو دیکھ بھال کے لیے محکمہ آثار قدیمہ کے سپرد کیا گیا تھا، تاہم محکمے کی عدم توجہی اور غفلت کے باعث یہ تاریخی عمارت کھنڈر بن گئی۔ گزشتہ سال محکمہ آثار قدیمہ پنجاب نے شیخوپورہ میں مغلیہ دور میں تعمیر کردہ اس ۴۰۰ سال پرانے قلعے کو بحال کرنے کا فیصلہ کیا۔

اس کام کا آغاز خستہ حال عمارت کے اندرونی حصوں کی تزئین و آرائش اور بیرونی دیوار کی بحالی سے کیا گیا۔ گو کہ قلعے سے ملحقہ رانی محل کا نصف سے زیادہ حصہ منہدم ہو چکا ہے لیکن داخل ہونے کا راستہ موجود ہے۔ وہاں پر مغل اور سکھ ادوار کی نادر تصاویر دیکھی جا سکتی ہیں۔ اس کے اوپر شیش محل تھا، جس کی چھت اب بھی کسی حد تک موجود ہے لیکن اوپر جانے کا راستہ نہایت تنگ ہے۔

ایک روایت کے مطابق قلعے کے شمال مغربی برج کے اندر سے ایک سرنگ ہرن مینار تک جاتی ہے، جس کے کچھ آثار بھی ملے ہیں۔ اس تاریخی ورثہ کی بحالی سے نوجوان نسل بالخصوص طلبا اس قلعے کے بارے میں مزید جان سکیں گے

قلعہ منکیرہ:

منکیرہ پنجاب کے ایک بڑے صحرا تھل کے عین وسط میں واقع ہے، جھنگ بھکر روڈ شہر کے درمیان سے گزرتا ہوا شہر کو دو حصوں میں تقسیم کر رہا ہے جھنگ بھکر روڈ سے چند سو گز جنوب میں یہ قدیم تاریخی قلعہ واقع ہے اس قلعے کی تعمیر کا کام تاریخی ریاست منکیرہ پر مسلمانوں کے آخری فرمانروا نواب سربلند خان سدوزئی نے ۱۸۰۴ء میں کیا۔

ریاست منکیرہ جس کی بنیاد ۱۷۷۲ء میں ڈیرہ اسمٰعیل خان کے سربلند خان نے رکھی تھی۔ یہ ایک وسیع و عریض ریاست تھی جس کا دارالحکومت منکیرہ تھا اور جس کی سرحدوں میں سندھ دوآب، بھکر، لیہ، میانوالی، ڈیرہ اسمٰعیل خان اور بنوں کے کچھ علاقے شامل تھے۔ اُس زمانے میں یہ قلعہ دور و نزدیک رعب و دبدبے کی علامت تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب مشرقی اور وسطی پنجاب سکھوں کے قبضے میں چلا گیا تھا اور ۱۷۷۲ء میں احمد شاہ ابدالی کی وفات کے بعد افغانوں کا اقتدار بھی کمزور پڑنے لگا تھا۔ ایسے میں سربلند خان کی منکیرہ سلطنت عروج کی منزلیں طے کرنے لگی۔ اٹھارہویں صدی کے ہندوستان میں مغلوں اور درانیوں کے مقابلے میں ایک تیسری قوت سکھوں کی تھی جن کا رہنما رنجیت سنگھ تھا جس نے سکھوں کے مختلف گروہوں کو یکجا کیا اور اِدھر اُدھر کی ریاستوں کو اپنی سلطنت میں شامل کرنے لگا۔ وہ مختلف ریاستوں پر حملہ کرتا اور ان سے خراج وصول کرتا۔ یوں رنجیت سنگھ کی سلطنت معاشی لحاظ سے ایک مستحکم سلطنت تھی یہی وجہ ہے کہ رنجیت سنگھ کی فوج میں غیر ملکیوں کو بھاری معاوضے پر بھرتی کیا گیا تھا۔ فوج کی ٹریننگ اور جدید اسلحے کے لیے فنڈز مختص کیے گئے تھے۔ یوں پنجاب میں سکھوں کی حکومت ارد گرد کی ریاستوں کے لیے

مسلسل خطرے کا باعث تھی۔ ۱۷۷۹ء میں رنجیت سنگھ کا پنجاب کے سب سے اہم شہر لاہور پر قبضہ ہو چکا تھا۔ پھر ایک کے بعد ایک ریاست رنجیت سنگھ کا نشانہ بننے لگی۔ رنجیت سنگھ کا اگلا نشانہ منکیرہ کی خوش حال ریاست تھی۔ یہ ۱۸۱۶ء کا سال تھا جب رنجیت سنگھ نے منکیرہ پر پہلا حملہ کیا اور خراج لے کر آگے بڑھ گیا۔ دوسری بار ۱۸۲۱ء میں رنجیت سنگھ کے لشکر نے ڈیرہ اسمٰعیل خان پر حملہ کیا جو سلطنتِ منکیرہ کا حصہ تھا۔ وہاں کے گورنر کو گرفتار کرنے کے بعد رنجیت سنگھ کے لشکر نے منکیرہ کا رُخ کیا جو سلطنتِ منکیرہ کا دارالحکومت تھا‘ جہاں ہر طرف ریت کے ٹیلے تھے اور گرمی سے تپتی ریت پیاس کی شدت کو بڑھا رہی تھی۔ پانی کے فقدان نے رنجیت سنگھ کے لشکر کو پریشان کر دیا۔ آخر انہوں نے کنویں کھودنا شروع کر دیے۔ منکیرہ کے علاقے میں پانی کی سطح بہت اوپر ہے لہٰذا جلد ہی پانی کی فراہمی شروع ہو گئی۔ نواب حافظ احمد خان نے ہتھیار ڈالنے سے انکار کر دیا۔ سکھوں نے قلعے کا محاصرہ کیا ہوا تھا اور قلعے کی سپلائی لائن کاٹ دی گئی تھی۔ یہ محاصرہ طول کھینچتا گیا‘ ہر گزرنے والا دن قلعے کے مکینوں کی زندگیاں مشکل تر بنا رہا تھا۔ اب نواب حافظ احمد خان کے ساتھیوں کے حوصلے ٹوٹ رہے تھے اور ان میں سے کچھ نے خفیہ طور پر رنجیت سنگھ کے لشکر کے ساتھ رابطہ کر لیا اور اس کی فوج کے ساتھ جا ملے۔ گھر کے ان بھیدیوں نے رنجیت سنگھ کے لشکر کو قلعے کے کمزور مقامات کے حوالے سے تمام معلومات فراہم کر دیں۔ اب رنجیت سنگھ کے لشکر کے حملے میں شدت آ گئی تھی۔ قلعے کے مکینوں نے بھرپور مزاحمت کی لیکن اب محاصرے کو بائیس دن ہو چکے تھے اور نواب کی فوج میں بددلی پھیل گئی تھی۔ نواب کو اہم فیصلہ کرنا تھا‘ اپنی زندگی کا مشکل ترین فیصلہ۔ اسے اپنے اقتدار کی قربانی دے کر قلعے کے مکینوں کو مزید قتل و غارت سے بچانا تھا۔ نواب نے رنجیت سنگھ کو پیغام بھیجا کہ وہ

قلعے کو چھوڑنے کے لیے تیار ہے بشرطیکہ اسے اپنے ساتھیوں کے ہمراہ ڈیرہ اسمٰعیل خان کی جاگیر پر جانے کی اجازت دی جائے۔ رنجیت سنگھ نے یہ شرط مان لی۔

اس قلعے کی تعمیر بارہ سال کے عرصے میں مکمل ہوئی قلعے کی تعمیر کا کام مکمل ہونے کے بعد اس کے بانی نواب سربلند خان انتقال کر گئے یہ قلعہ کم و بیش پچاس ایکڑ رقبہ پر مشتمل ہے قلعہ کے شمالاً جنوباً اور مشرقاً غرباً چار دروازے اور اس کے ہر گوشہ میں ایک برج ۴۵ فٹ سے زیادہ بلند ہیں قلعہ کی دیواروں کی بلندی بیس فٹ اور موٹائی بیس فٹ سے زائد ہے ان دیواروں پر جگہ جگہ مورچے بنے ہوئے ہیں قلعہ کی بیرونی جانب چاروں اطراف ایک خندق تھی قلعہ سے باہر خندق کے ساتھ ساتھ چاروں طرف ایک ایک کنواں تھا جن کی تعداد ۱۲ تھی ہر خندق کو پر آب رکھنے کے لیے ہر وقت چلتے رہتے تھے خندق کی چوڑائی چالیس فٹ اور گہرائی ۱۵ فٹ تھی قلعے کے اندر جا بجا مکانات کے آثار موجود ہیں قلعہ کے اندر جو درخت اور باغات تھے وہ آج ناپید ہیں۔ سکھ دور حکومت میں دیوان لکھی مل نے اس قلعہ سے مسلمانوں کو نکال کر ہندوئوں کو آباد کیا اس قلعہ کے اندر ایک اور قدیم قلعہ موجود ہے جو عمومی طور پر بلوچاں کے نام سے مشہور ہے یہ قلعہ تقریباً دس ایکڑ رقبہ پر محیط ہے (۱۳۰) ۵۴۰ ق۔م میں مل قوم کے راجہ مل کھیڑہ نے ایک قلعہ تعمیر کیا جس کا نام مل کھیر کوٹ رکھا جسے عرب تاجر اور مورخین نے اپنی عربی لہجے میں نیکر کوٹ کہتے جو وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ منکیرہ کے نام مشہور ہوا ۷۱۲ء میں محمد بن قاسم نے جرنیل ابوالاسود جیم بن زحر ثقفی نے کوٹ کروڑ بھکر اور نیکر کو فتح کر کے احمد بن خزیمہ بن عتبہ مدنی کو ان علاقوں کا گورنر مقرر کیا پھر شیخ حامد موسیٰ گورنر بنے جنھوں نے اس قدیم قلعہ کی تعمیر و مرمت کرائی پھر میکن قوم نے اپنی سنہری دور میں قلعہ منکیرہ کی

مرمت کروائی۔ ۹۸۰ء میں امیر سبکتگین ملتان پر حملہ کرنے کے لیے یہاں سے گذرا تو اس نے منکیرہ کے قلعہ قدیم کی تعریف کی مکینوں کے عہد حکومت میں سہہ پال نامی شخص جو میکن افواج کا سالار اعلیٰ تھا۔ ۱۳۸۰ء میں قلعہ منکیرہ کی از سر نو تعمیر و مرمت کی گئی قلعہ کی دیواروں کو چاروں اطراف سے تیس تیس فٹ بلند کیا قلعہ کے گرد خندق کھدوائی جو ۴۰ فٹ چوڑی اور ۱۵ فٹ گہری تھی اس کے ارد گرد چاروں طرف ۴ کنویں بنوائے گئے اور ایک کنواں قلعہ کے اندر بنوایا میکنوں کے بعد لنگاہ، ہوت، میرانی، رند، جسکانی ''کلہوڑہ بلوچوں نے یکے بعد دیگرے منکیر پر سوا تین سو سال تک حکمرانی کی اور قلعہ کی تعمیر و مرمت میں خصوصی دلچسپی لی۔ قلعہ کے چاروں اطراف بیس برج بنوائے گئے۔ نواب سربلند خان نے ۱۸۰۴ء میں قلعہ منکیرہ کے اندر ایک شاندار مسجد تعمیر کرائی یہ مسجد قلعہ بلوچاں کے باہر شمالی جانب اور قلعہ سربلند خان کے اندر غربی سمت واقع ہے۔ ۱۸۲۱ء میں جب رنجیت سنگھ منکیرہ پر حملہ کیا تو اس نے منکیرہ سے دو کلو میٹر جنوب ایک اونچا تاریخی ٹیلہ کلی والا سے زمزمہ توپ سے گولہ داغ کر مسجد کا جنوبی مینار شہید کر دیا۔ مارچ ۱۸۱۶ء میں نواب سربلند خان کے ہاں کوئی اولاد نرینہ نہ تھی ان کی وفات کے بعد ان کے بھانجے حافظ احمد خان اور نواسے شیر محمد خان ان کے جانشین مقرر ہوئے انہوں نے سربلند خان کا مقبرہ تعمیر کروایا۔ یہ مقبرہ قلعہ منکیرہ کے اندر جنوبی دیوار کے ساتھ ہے بعد ازاں جب رنجیت سنگھ نے ریاست منکیرہ پر قبضہ کر لیا تو نواب سربلند خان کی مسجد کے چند گز کے فاصلے پر ہندوئوں کا مندر تعمیر کر دیا گیا اور مسلمانوں کی عبادت پر پابندی لگا دی گئی۔ نواب کی مسجد کو اصطبل بنا دیا گیا۔ وقت کے ساتھ مناسب دیکھ بھال نہ ہونے کی وجہ سے قلعہ منکیرہ کی دیواریں شکست و ریخت میں بدلنے لگیں ہیں۔

قلعہ میر گڑھ فورٹ عباس:

قلعہ میر گڑھ چولستان کے صحرائی علاقے میں واقع ہے، جو صوبہ پنجاب کے ضلع بہاولنگر میں آتا ہے۔ یہ علاقہ اپنے وسیع ریتلی زمین اور تپتے ہوئے موسم کے لیے جانا جاتا ہے۔

جام خان کے بیٹے نور محمد خان نے ۱۷۹۹ء میں اس قلعہ کی تعمیر شروع کی تھی اور ۱۸۰۳ء میں اس قلعہ کو مکمل کیا گیا۔ قلعہ میر گڑھ کی تعمیر کا مقصد علاقے کو دشمنوں کے حملوں سے محفوظ رکھنا تھا۔ یہ قلعہ چولستان کے صحرائی علاقے میں ایک اہم دفاعی نقطہ تھا اور اس کا استحکام علاقے کی سلامتی کے لیے انتہائی ضروری تھا۔

قلعہ میر گڑھ اس وقت کے حکمرانوں کے لیے ایک اہم دفاعی چوکی تھا۔ قلعہ میر گڑھ کی تعمیر میں مقامی مواد جیسے کہ اینٹیں اور مٹی استعمال کی گئی ہیں۔ قلعے کی دیواریں بلند اور مضبوط ہیں، جو اسے دشمن کے حملوں سے محفوظ رکھتی تھیں۔ اس قلعہ کا بیرونی حصہ پختہ، ایک داخلی دروازہ اور چار مینار تھے۔ داخلی دروازے کے دو حصے تھے، بیرونی دروازے پر لوہے کی سلاخیں منڈھی ہوئی تھیں، پھر اندر ڈیوڑھی تھی اس کے بعد اندر کا دروازہ تھا۔ قلعہ کے صحن میں رہائشی مکانات تھے، صحن میں دو میٹھے پانی کے کنویں تھے جو اب خشک ہو کر بھر گئے ہیں۔ اس قلعے کی اونچی دیواریں مٹی سے بنی ہوئی۔ قلعے کے اندر مختلف کمرے، راہداریاں، اور حفاظتی برج بنائے گئے تھے، جو اس کی دفاعی اہمیت کو ظاہر کرتے ہیں۔ قلعہ کے باہر ایک چھوٹی سی مسجد کے آثار بھی موجود ہیں۔ قلعہ میر گڑھ کی موجودہ حالت وقت کے ساتھ خراب ہو چکی ہے، اس وقت قلعہ کی فصیل

بالکل شکستہ حالت میں ہے۔ اندر کے مکانات مٹی کا ڈھیر بن گئے ہیں۔ یہ قلعہ بہت ہی خستہ حالت میں ہے اور محکمہ آثار قدیمہ کی توجہ کا طلب گار ہے۔ حکومتِ پاکستان اس قلعے کی بحالی کے لیے بلکل کام نہیں کر رہی ہیں۔ قلعہ کے باہر کوئی تعارفی بورڈ نہیں ہے نہ ہی بیٹھنے کے لیے کوئی بینچ۔ اگر اس قیمتی ورثہ کی حفاظت نہ کی گئی تو بہت جلد یہ روئے زمین سے اپنا نقش مٹا دے گا۔

قلعے کی سیر کرتے ہوئے سیاح نہ صرف اس کی تعمیرات سے لطف اندوز ہو سکتے ہیں بلکہ چولستان کے صحرا کی قدرتی خوبصورتی کا بھی مزہ لے سکتے ہیں۔ ضروری ہدایات:

i. چولستان کا درجہ حرارت عام طور پر ۵۰ ڈگری کے قریب رہتا ہے اس لیے گرمی سے بچنے کے لیے پہلے سے انتظامات کر کے جائیں۔

ii. پینے والے پانی کی کمی رہتی ہے روئی میں داخل ہونے سے پہلے پانی رکھ لیں ساتھ۔

iii. انٹرنیٹ کی سہولت بہت کم ملتی ہے اس لیے کوشش کریں کے جو فاصلے ہیں وہ نوٹ کر لیں تاکہ موبائل نہ چلنے کی صورت میں بھی آپ کو اندازہ رہے کہ آپ نے کس طرف جانا ہے۔

iv. گرمی کی شدت کی وجہ سے موبائل کام کرنا چھوڑ دیتے ہیں اس لیے کوشش کریں کہ انہیں ضرورت کے وقت ہی استعمال کریں۔

قلعہ مروٹ ضلع بہاولنگر:

یہ قلعہ ضلع بہاولنگر صحرائے چولستان کے مرکز میں واقع ہے۔ مروٹ قلعہ کا بڑا حصہ اب غائب ہو چکا ہے لیکن کسی زمانے میں یہ حکمرانوں کی شان و شوکت کی علامت ہوا کرتا تھا۔ مروٹ قلعہ کی بنیاد چٹو کے حکمران نے رکھی تھی۔ شیر شاہ سوری کے دور میں اس قلعے کی مرمت کی گئی کیونکہ یہ ملتان اور دہلی کو ملانے والی گزرگاہ کے ساتھ واقع تھا۔ قلعہ مروٹ کو اس وقت زیادہ اہمیت حاصل ہوئی جب شہنشاہ جلال الدین اکبر یہاں ٹھہرا اور اس نے ۹۲۶ ہجری میں ایک مسجد بھی تعمیر کروائی، جو آج بھی موجود ہے۔ اس قدیم قلعے کی خستہ حالی اور بوسیدگی اور اس کے آثار کئی نسلوں کی کہانیاں اور راز اپنے اندر سموئے ہوئے ہیں۔ یہ آثار زمانے کی کج روی، فلک کی نامہربانی اور موسموں کی سختی کے گواہ ہیں۔

قلعہ مروٹ کے دروازے پر کبھی ایک کتبہ دیکھا گیا تھا جس پر مروٹ پاتھا، ملک جام سومرا، کوٹ پکی کھیل پھیرائی تحریر تھا۔ تاریخ نویسوں اور ماہرینِ آثار نے اس کتبے سے

جانا کہ اس قلعے کو کسی زمانے میں جام سومرا نے بھی استعمال کیا اور ۱۹۴۱ میں اس کی مرمت کا کام بھی کروایا تھا۔

تاریخی تذکروں میں لکھا ہے کہ اسے چتوڑ کے مہروٹ نے تعمیر کرایا تھا اور اسی کی راجا چچ سے جنگ بھی ہوئی تھی۔ اس کے بعد ہی قلعے کا نام قلعہ مہروٹ رکھا گیا جسے بعد میں مروٹ بولا جانے لگا۔

یہ قلعہ چوں کہ ایک بلند ٹیلے پر تعمیر کیا گیا تھا، اس لیے دور ہی سے اس کے آثار نظر آجاتے ہیں۔ قلعہ مروٹ کی فصیل کے ساتھ بڑے برج بنائے گئے تھے جب کہ اس قلعے کے مغربی جانب بڑھیں تو وہاں ایک محل کے آثار بھی ملتے ہیں۔ اس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ بیکانیر کے مہاراجا کا قصر تھا۔

فورٹ عباس:

تاریخ کے اوراق پلٹیے یا پھر دیگر مذاہب کی مقدس و مشہور کتابیں کھولیے۔ تہذیب کے شواہد زیادہ تر دریائوں کے کنارے ہی پائے گئے ہیں اور یہی وادی ہاکڑہ کے قدیم ہونے پر صادق آتی ہے۔ وادی ہاکڑہ اس دور کے بہت بڑے دریا ہاکڑا (دوسرا نام گھاگرا) کے کنارے آباد تھی۔ یہ علاقہ اپنی زرخیزی اور خوشحالی کے لحاظ سے ایک مستحکم ترین علاقہ تھا۔ یہاں پر باقاعدہ بندرگاہیں بنی ہوئیں تھیں اور یہاں کا مال بحری جہازوں سے دجلہ اور فرات کی وادیوں کے لیے تجارت کیا جاتا تھا۔ آج کی وادی ہاکڑہ اور فورٹ عباس تحصیل اور صحرائے چولستان کے مجموعے کا نام ہے قیام پاکستان سے پہلے اور بعد میں اس سرزمین کی بارہا کھدائی کروائی گی یہاں کئی ایک پرانی تہذیبوں کے آثار ملے۔ سرزمین ہاکڑا جن محقق لوگوں کے مشاہدات زیر غور رہی ان میں سر ارل اسٹائن، ہنری فلیڈ، سر موٹیمز کرنل منچین، مرزا شاہ گردیزی اور ڈاکٹر تشاوی قابل ذکر ہیں۔ ان سب نے اس سرزمین سے ملنے والے نوادرات کا طبعی اور کیمیائی مشاہدہ کیا۔ اپنے ان تجربات اور مشاہدات سے اس کو ۵۰۰۰ ق م تک پرانا علاقہ ثابت کیا لیکن حالیہ چند دہائیوں کی تحقیق جو کہ ڈاکٹر محمد رفیق مغل سابق سربراہ نیشنل میوزیم کراچی نے کی اس کو بالکل درست تسلیم کیا ہے بہت سے قدیم نوادرات اس وقت بھی نیشنل میوزیم کراچی میں موجود ہیں۔ پانی اس سرزمین کی

زرخیزی اور نوخیزی کے لیے بہت اہم رہا لیکن یہی وہ راستہ اور وجہ بھی رہا اسے زمانہ قدیم میں بار بار جنگی حالات کا سامنا کرنا پڑا۔ تقریباً ۳۰۰۰ ق م اور ۳۵۰۰ ق م کے درمیان کہیں یہ علاقہ آریائی قوم نے بہت زیادہ جنگ و جدل کے ساتھ حاصل کیا اور محکوم قوموں کو شودر کا نام دیا جو کہ پورے ہندوستان میں پھیل گئے۔ شودر قوم صدیوں سے آج بھی ہندوئوں کے ہاں گندی اور ذلیل قوم تصور کی جاتی ہے۔ یہ خطہ اس کے بعد سکندر اعظم کے ہاتھوں فتح ہوا۔ پھر کئی حکمرانوں کے زیر نگیں آباد اور بہت سے لوگوں سے چھنتا رہا۔ پھر یہ سب دریا دوسرے راستوں پر بہہ نکلے۔ کچھ سوکھ گئے اور یہ زرخیز ترین علاقہ خشک سالی کا شکار ہوا۔ لوگ بھی دوسرے علاقوں کو ہجرت کر گئے۔ صدیوں بعد یہ پھر آباد ہوا۔ چولستان کے نام سے مشہور اس خطہ ارض میں زرخیزی کی رمق نظر آئی لیکن اپنی گزشتہ زرخیزی کے سامنے یہ اب بھی شرمندہ ہے۔ اکثر و بیشتر خشک سالی کا شکار رہتا ہے۔ وادی ہاکڑا کو قلعوں کی سرزمین بھی کہا جاتا ہے جن میں قابل ذکر نام سردار گڑھ پھول نگر (پھولڑہ فورٹ عباس) قلعہ میر گڑھ، قلعہ جام گڑھ اور قلعہ مروٹ سے ہوتے ہوئے قلعہ دراوڑ سے جا ملتے ہیں۔ بغداد میں ہلاکو خان کے ہاتھوں شکست پا کر عباسی خاندان ہندوستان میں پناہ گزین ہوا اور یہاں ریاست بہاولپور کا قیام عمل میں آیا۔ بہاولپور ریاست کے بانی نواب محمد صادق عباسی اول تھے۔ ریاست کی زرخیزی سے اناج، وافر مقدار میں پیدا ہونے لگا تو خرید و فروخت کے لیے یہاں منڈیاں بنائی گئیں۔ ۱۹۲۷ء میں بستی پھولڑہ کو منڈی فورٹ عباس کا نام دے کر تحصیل کا درجہ دیا گیا۔ فورٹ عباس میں ایک دفعہ عباسیہ (پھولڑہ) کے نام سے مشہور تھا اس لیے نواب محمد صادق پنجم نے اس شہر کا نام فورٹ عباس (اپنے بڑے بیٹے محمد عباس کے نام پر) رکھا یعنی عباس کا قلعہ ۱۹۵۵ء تک اس علاقے میں ریاست

بہاولپور کے ڈاک ٹکٹ اسٹامپ اور سیاہ تکونی پرچم (ریاست بہاولپور کا جھنڈا) جن پر ریاست بہاولپور کے نوابین کی تصویریں پرنٹ تھیں چلتے رہے پھر جب مغربی پاکستان کو ون یونٹ کا درجہ دیدیا گیا اور بہاولپور کو کمشنری کا درجہ حاصل ہو گیا تو پہلی بار قومی پرچم لہرایا گیا۔ ۱۹۶۹ء میں ایک عجیب واقعہ رونما ہوا۔ صدیوں پہلے روٹھ کر سونے والا دریائے گھاگرا (ہاکڑا) ایک بار پھر غضب بن کر اٹھا اور سیلاب برپا کر دیا پانی نے فورٹ عباس کو تین اطراف سے گھیر لیا۔ شہر تو ریلوے لائن کی وجہ سے بچ گیا لیکن اردگرد کے علاقے کو خاصہ نقصان پہنچا۔ اب بھی ہر سال دریا اپنے ہونے کا احساس ضرور دلاتا ہے۔ لیکن ۱۹۷۹ء میں پاک فوج کی مدد سے فلڈ چینل پر سائفن قائم ہونے سے سیلاب کے خدشات بہت کم ہو گئے ہیں۔ قلعہ فورٹ عباس (قلعہ پھولڑہ) فورٹ عباس کے نواحی علاقے میں واقع ہے۔ جہاں فورٹ عباس کی قدیم آبادی مقیم ہے۔ اس کے قیام کا بالکل درست وقت تو معلوم نہیں لیکن اندازاً یہ ۳۰۰۰ ق م یا سکندریہ دور کا بتایا جاتا ہے۔

قلعہ غضنفر گڑھ:

خان گڑھ ضلع مظفر گڑھ سے علی پور کی طرف جائیں تو چند میل کے فاصلے پر ایک سٹاپ لوہار والا آتا ہے، لوہار والا سے بائیں طرف دریائے چناب کی طرف جاتے ہوئے کم و بیش ایک کلو میٹر کے فاصلے پر ایک اونچا ٹیلہ دکھائی دیتا ہے، ارد گرد کی آبادی سے تقریباً ۱۰ فٹ بلند یہ ٹیلہ قلعہ غضنفر گڑھ ہے جو وقت کی گرد میں چھپا ہوا ایک تاریخی مقام ہے اس قلعہ اور مابعد رہائشی مقام کی کہانی ملتان کے سابق حکمران سدوزئی خاندان سے جڑی ہوئی ہے، یہ قلعہ نواب شجاع خان بانی شجاع آباد کے منجھلے صاحبزادے نواب غضنفر خان کے نام پر تعمیر کیا گیا تھا۔

خطہ ملتان پر ماضی میں بہت سے نامور خاندانوں اور حکمرانوں نے حکومت کی۔ ان کے نام تو تاریخ کے صفحات پر محفوظ رہ گئے لیکن اس خطے میں آباد شہروں اور لوگوں کی زندگی سے محو ہو گئے، وقت کے اس تیز بہائو میں تاج و تخت کا نام و نشان بھی نہیں رہ سکا، ہاں شہروں کی تاریخ ان حکمرانوں کے نام ضرور محفوظ رکھتی ہے جو وقت سے مختلف انداز میں ہم کلام ہوتے ہیں جیسے ماضی میں خطہ ملتان پر حکومت کرنے والا سدوزئی خاندان، اس خاندان نے خطہ ملتان پر کم و بیش نصف صدی تک حکومت کی، گو ملتان پر حکومت کرنے والا اس خاندان کا پہلا فرد نواب زاہد خان تھا لیکن جس شخص نے یہاں سدوزئی خاندان کی حکومت کو ایک مضبوط بنیاد فراہم کی وہ نواب شجاع خان تھا۔

نواب شجاع خان کا تعلق پٹھانوں کے معروف سدوزئی قبیلہ کی شاخ موریہ خیل معروف بہ خان خیل سے تھا۔ نواب شجاع خان اور احمد شاہ ابدالی تقریباً ہم عمر تھے، جب

ملتان میں احمد شاہ ابدالی کی والدہ زرغونہ کا انتقال ہوا تو نواب زاہد خان کی اہلیہ جو رشتہ میں احمد شاہ ابدالی کی خالہ تھیں نے اسے اپنی تولیت میں لے لیا تھا، یوں احمد شاہ ابدالی اور نواب شجاع خان رضاعی بھائی بن گئے تھے، نواب شجاع خان کی خطہ ملتان کی تاریخ میں اہمیت تین حوالوں سے ہے ایک تو انہوں نے اس خطے میں سدوزئی خاندان کو حکومت کی ایک مضبوط بنیاد فراہم کی، نواب شجاع خان کابل کے پٹھان حکمرانوں کی طرف سے تین بار ملتان کے گورنر بنائے گئے۔

ان کے بعد تقریباً ۳۹ سالہ دور حکومت ان کے بیٹے نواب مظفر خان کا بھی رہا، تاریخ ملتان میں نواب شجاع خان کی اہمیت کا دوسرا حوالہ ان کی سکھوں کے خلاف مزاحمت ہے، انہوں نے کابل کے پٹھان حکمرانوں کے ساتھ مل کر بہت سال تک سکھوں کو ملتان کی حدود سے دور رکھا، خطہ ملتان کی تاریخ میں نواب شجاع خان کی اہمیت کا تیسرا حوالہ ان کے آباد کردہ وہ شہر ہیں جو انہوں نے اپنے اور اپنے اہل خانہ کے نام پر آباد کئے، ان کے آباد کردہ شہروں میں شجاع آباد، خان گڑھ، سکندر آباد، غضنفر گڑھ اور مظفر گڑھ شامل ہیں، یہ شہر اور قصبے آج بھی ان کے اور ان کے اہل خانہ کے نام کو زندہ رکھے ہوئے ہیں آج ہم آپ کو وقت کی گرد میں چھپے ایک تاریخی قلعہ غضنفر گڑھ کی کہانی سنا رہے ہیں۔

نواب شجاع خان جو نواب زاہد خان سدوزئی کے چھوٹے فرزند تھے نے آخری وقت میں اپنے والد نواب زاہد خان کی بہت زیادہ خدمت کی تھی، اس لئے وفات کے بعد ان کی ساری دولت نواب شجاع خان کے حصے میں آئی، "تذکرۃ الملوک" جو شہزادہ علی محمد خان سدوزئی کی فارسی تصنیف ہے سدوزئی خاندان کے مفصل حالات سامنے لاتی ہے، اس

تاریخی کتاب کے مطابق "نواب شجاع خان مواضعات اور زرعی زمینیں خریدنے کا مریض تھا اس نے باپ کی وفات کے بعد بہت سے مواضعات اور زرعی زمینیں خریدیں، اس طرح نواب شجاع خان صوبہ ملتان کی قابل کاشت اراضیات کے ایک چوتھائی حصے کا مالک بن بیٹھا مواضعات خریدنے کے ساتھ ساتھ اسے نئے قلعہ جات کی تعمیر سے بھی بہت زیادہ دلچسپی تھی"۔

کہا جاتا ہے کہ نواب شجاع خان جو صوبہ ملتان میں بہت بڑی زرعی اراضی کے مالک تھے، اپنی جاگیر سے بہت زیادہ آمدنی حاصل کرتے تھے، انہوں نے اس خطے میں زراعت کے فروغ میں بھی اہم کردار ادا کیا، انہوں نے اپنے علاقوں کی حفاظت کیلئے مناسب مقامات پر خان گڑھ، شجاع آباد، سکندر آباد، غضنفر گڑھ کے قلعے تعمیر کرائے، نواب شجاع خان کے تعمیر کردہ یہ تمام قلعے شہر نما قلعے تھے، تذکرۃ الملوک کے مطابق نواب شجاع خان نے ۱۷۴۸ء میں شجاع آباد شہر کی بنیاد رکھی، یہ شہر ۱۷۷۲ء تک تکمیل کے مراحل سے گزرتا رہا، ۱۷۷۲ء میں شجاع آباد کے گرد پختہ فصیل تعمیر کرائی گئی۔ شجاع آباد کے نواح میں انہوں نے اپنے بیٹے سکندر خان کے نام سکندر آباد قلعہ بنوایا، دریائے چناب کے کنارے نواب شجاع خان نے ایک قلعہ نما شہر خان گڑھ کے نام سے آباد کیا عوام کو رہائش کے لئے مکانات بلکہ گزر اوقات کیلئے اراضیات بھی دی گئیں۔ شجاع آباد اور خان گڑھ کے درمیان دریا سے گزرنے کیلئے گھاٹ بنوایا اور کشتیوں کا انتظام بھی کیا گیا جن کا کام مسافروں کو دریا سے مفت گزارنا تھا، نواب شجاع خان نے دریا کے دونوں طرف لنگر جاری کئے جہاں مسافروں کو دو وقت کا کھانا مفت ملتا تھا، مولانا نور احمد

خان فریدی کی "تاریخ ملتان" کے مطابق کسی دور میں دریا کے دونوں طرف "لنگراویں" نام کی بستیاں بھی آباد تھیں۔

مولانا نور احمد فریدی کی "تاریخ ملتان" دیگر تاریخی کتابوں کے ساتھ ساتھ خان گڑھ کی صدری تاریخ کے مطابق قلعہ خان گڑھ نواب شجاع خان نے اپنی بیٹی خان بی بی کے نام پر آباد کیا تھا لیکن "تذکرہ الملوک" جو نواب مظفر خان کے ہم عصر شہزاد علی محمد خان کی فارسی تصنیف ہے میں ایک اور روایت سامنے آتی ہے، وہ یہ کہ نواب شجاع خان نے خان گڑھ اپنی پھوپھی خدیجہ معروف بہ خان بی بی کے نام پر آباد کیا تھا، تذکرۃ الملوک کے مطابق "نواب شجاع خان کی پھوپھی جن کا نام خدیجہ تھا نواب عابد خان سدوزئی کی بیٹی تھیں یہ عبداللہ خان معروف بہ جیون خان کی زوجہ تھیں، جوانی میں بیوہ ہو گئی تو اپنے بھائیوں اور بھتیجوں کے پاس رہنے لگیں، انہوں نے بڑی لمبی عمر پائی، یہ بہت عابدہ اور زاہدہ تھیں، پشتو اور فارسی میں شعر کہتی تھیں، خان گڑھ کا قلعہ انہی جان حور معروف بہ خان بی بی کے نام پر قائم ہوا"۔

تذکرۃ الملوک کے ساتھ ساتھ عمر کمال خان ایڈووکیٹ کی کتاب "نواب مظفر خان اور ان کا عہد" میں بھی قلعہ خان گڑھ کی تعمیر انہی خان بی بی سے منسوب کی گئی ہے۔ سدوزئی خاندان کا آباد کردہ ایک اور شہر مظفر گڑھ ہے جو نواب شجاع خان کے سب سے بڑے صاحبزادے نواب مظفر خان گورنر ملتان نے اپنے دور حکومت میں تعمیر کرایا، کہا جاتا ہے اس کی بنیاد ۱۷۹۴ء میں رکھی گئی، یہاں بھی قلعہ نما شہر تعمیر کرایا گیا، قلعہ مظفر گڑھ کی

تعمیر سے پہلے ملتان سے ڈیرہ غازیخان جانے والی سڑک پر ایک دکان اور چند مکانات تھے، اس وقت یہ علاقہ موسن ہٹی کہلاتا تھا۔

نواب شجاع خان کے آباد کردہ شہر شجاع آباد، خان گڑھ، سکندر آباد کسی نہ کسی حوالے سے آج بھی تذکروں میں رہتے ہیں لیکن ان کا تعمیر کردہ قلعہ غضنفر گڑھ وقت کی گرد میں چھپ گیا ہے، یہ چھوٹا تاریخی قلعہ نہ تو سدوزئی خاندان کے حوالے سے پہچانا جاتا ہے نہ ہی اس قلعہ کا اس علاقے کی تاریخ میں کوئی کردار نظر آتا ہے، نہ ہی تاریخ کی کتابوں میں اس شخص کے نام کا حوالہ ملتا ہے جس کے نام پر یہ قلعہ آباد کیا گیا۔ ملتان کی تاریخ میں نواب شجاع خان اور ان کے صاحبزادے نواب مظفر خان کے بارے میں تو تفصیلی تذکرے ملتے ہیں لیکن نواب شجاع خان کے دیگر صاحبزادگان نواب سکندر خان، نواب غضنفر خان اور نواب سنجر خان کے بارے میں زیادہ تفصیل نہیں ملتی۔

تذکرۃ الملوک ہی ایک ایسی کتاب ہے جس میں نسبتاً اختصار کے ساتھ ان کے حالات درج کئے گئے ہیں، تذکرۃ الملوک کے مطابق "نواب شجاع خان کا تیسرا صاحبزادہ غضنفر خان لائق اور عاقل تھا، جب جوان ہوا تو قلعہ غضنفر گڑھ اور دیگر مواضعات پر متصرف ہوا، باپ سے حاصل کردہ جائیداد سے ۲۸ ہزار روپے سالانہ آمدنی وصول کرتا تھا، نواب شجاع خان کی وفات کے وقت اس کی عمر ۲۰ سال تھی چونکہ جوان اور حسین تھا، کوئی روکنے ٹوکنے والا نہیں تھا، سو اپنی قیمتی عمر نشہ بازی اور نفسانی خواہشات کی پیروی میں بسر کی، نشہ میں اس قدر غرق رہتا تھا کہ سال سال غسل نہ کرتا تھا جس جگہ بیٹھا ہوتا وہاں سے اٹھنے تک کی اس میں سکت نہیں ہوتی تھی، سکھوں کی فتح کے بعد وہ حافظ احمد خان

سدوزئی کے پاس پہنچ گیا اور گزر بسر کیلئے اپنا وظیفہ مقرر کرایا جب سکھوں نے کچھی فتح کر لیا تو سندھ کی طرف چلا گیا جب والیان سندھ نے اسے اس حال میں دیکھا تو کچھ خاطر مدارت کر کے رخصت کر دیا، بڑی بے سر و سامانی کی حالت میں ملتان آیا پھر لاہور چلا گیا اور وہیں فوت ہوا، اس کا ایک بیٹا اور دو بیٹیاں تھیں جن میں سے ایک کی ماں باز خان سدوزئی کی بیٹی تھی جبکہ دوسری بیٹی کی ماں غلزئی افغان تھی، اس کی دونوں بیٹیوں کی شادی (ایک کے مرنے کے بعد) نواب سرفراز خان کے بیٹے فیروز الدین سے ہوئی۔ نواب غضنفر خان کے نام پر تعمیر ہونے والا قلعہ غضنفر گڑھ مابعد رہائش مقام کم و بیش ۴۰ بیگھہ زمین پر مشتمل تھا، یہ ایک ایسا دفاعی قلعہ تھا جو شجاع آباد اور خان گڑھ کے دفاع کیلئے تعمیر کیا گیا تھا اس قلعہ سے قلعہ خان گڑھ چند میل جبکہ اس قلعہ سے مشرقی سمت بہنے والے دریائے چناب کے پار شجاع آباد شہر واقع ہے، یہ قلعہ ارد گرد کی آبادی سے ۱۰ فٹ بلند ہے، قدرے بلندی پر اس قلعہ کو اس لئے تعمیر کیا گیا کہ دریائی سمت اور علی پور سے آنے والی سڑک پر نظر رکھی جاسکے، مرکزی شاہراہ سے ہٹ کر درختوں اور کھیتوں کے درمیان موجود یہ قلعہ ایک طرح سے خفیہ قلعہ تھا جہاں سے جنگ کے وقت دشمن پر آسانی سے حملہ کیا جا سکتا تھا اور دشمن کو اس قلعہ کی موجودگی کا پتہ بھی نہیں چلتا تھا۔ قلعہ غضنفر گڑھ کی کچی اینٹوں سے بنی ہوئی دیوار کم و بیش ۷ فٹ چوڑی تھی، اس کی فصیل پر چار بڑے برج تھے جہاں دشمن پر نظر رکھنے کیلئے باقاعدہ مسلح فوجی تعینات کئے جاتے تھے۔ مظفر گڑھ اور ملتان کی تاریخ قلعہ غضنفر گڑھ کی حقیقی تاریخ سامنے نہیں لائی نہ تو اس قلعہ پر ہونے والے کسی حملہ کا پتہ چلتا ہے نہ ہی یہاں کے دفاعی نظام اور فوجی طاقت کا کسی طور پر احاطہ ہوتا ہے' ہاں سکھوں نے اس قلعہ پر ۱۸۱۸ء اور اس سے پہلے بھی حملے کئے۔

اس وقت نواب غضنفر خاں ہی اس قلعہ پر متصرف تھا لیکن اس بات کا پتہ نہیں چلتا کہ اس قلعہ میں فوج کتنی تھی اور یہاں سے سکھوں کے خلاف کس سطح کی مزاحمت کی گئی۔ سکھوں نے ۱۸۱۸ء اور اس سے پہلے اپنے سات مشہور حملوں میں اس قلعہ کو بھی فتح کیا تھا۔ نواب مظفر خان کے عہد میں جو سکھوں کا آخری حملہ ہوا تھا اس میں بھی اس قلعہ پر حملہ کیا گیا تھا۔

سکھوں نے اس قلعہ کو فتح کرکے ان ہندوئوں کے حوالے کر دیا تھا جنہوں نے نواب مظفر خان کے خلاف جنگ میں ان کا ساتھ دیا تھا، دوسرے معنوں میں اس جنگ کے بعد اس قلعہ کی دفاعی حیثیت ختم ہوگئی تھی۔ قلعہ غضنفر گڑھ کی فصیل اور برج سکھوں کے خلاف جنگ میں شدید متاثر ہوئے تھے جب برٹش آرمی نے ملتان پر حملہ کیا تو شجاع آباد اور اس سے ملحقہ قلعہ خان گڑھ اور غضنفر گڑھ بھی شدید حملوں کی زد میں آئے تھے، باقی ماندہ فصیل اس جنگ میں ختم ہوئی۔ قلعہ غضنفر گڑھ کے ۲ دروازے اور ۴ برج تھے، اب ان میں سے ایک بھی باقی نہیں ہے۔ اس کا مرکزی دروازہ لوہار والا سے غضنفر گڑھ کی طرف آنے والی سڑک کے سامنے ہی واقع تھا۔

غضنفر گڑھ قلعہ کے اندر نواب غضنفر خان کے دور میں ایک مسجد بھی بنائی گئی تھی لیکن اس وقت اس مسجد کے آثار موجود نہیں ہیں، اس وقت جو مسجد ٹبہ غضنفر گڑھ پر موجود ہے وہ پرانی مسجد کی بنیادوں پر ہی تعمیر کی گئی ہے۔ ۱۸۱۸ء کے بعد جب یہ قلعہ نواب مظفر خان کے ساتھ جنگ میں ساتھ دینے والوں کے ہاتھ آ گیا تو یہ ہندوئوں کی آبادی پر مشتمل ایک ایسا منفرد مقام بن گیا جو اردگرد کی آبادی سے الگ تھلگ تھا اس قلعہ میں ایک

سو کے قریب گھرانے آباد تھے جو بیشتر ہندو ہی تھے لیکن کچھ کا تعلق سکھ دھرم سے بھی تھا جب یہ قلعہ مکمل طور پر رہائشی مقام بن گیا تو اس میں ایک مندر، دھرم شالا اور گوردوارہ تعمیر کیا گیا، دریا کی سمت جہاں قلعہ غضنفر گڑھ کی حدود ختم ہو رہی ہیں ادھر ہندوئوں کی آخری رسومات ادا کرنے کے لیے مسان بھی موجود تھا۔

قلعہ غضنفر گڑھ میں آباد سارے ہندو یا تو زمیندار تھے یا کاروباری، غضنفر گڑھ قیام پاکستان سے پہلے ایک کاروباری مرکز بھی تھا اس میں موجود ایک چھوٹا سا بازار ارد گرد کے علاقوں کے لوگوں کی تمام ضروریات زندگی پوری کرتا تھا یہاں سنار، بزاز، لوہار اور پرچون کی دکانیں تھیں جہاں تمام تاجر ہندو تھے اور ارد گرد کے تمام دیہات کے لوگ یہیں خریداری کرتے تھے یہاں آباد ہندو جو زمیندارہ اور ساہوکارہ کرتے تھے خاصے متمول تھے، قیام پاکستان سے پہلے غضنفر گڑھ ہندو ثقافت کا گڑھ تھا ارد گرد خوبصورت کھیتوں سے گھرا ہوا یہ قلعہ علاقہ بھر میں منفرد مقام تھا یہاں کے متمول ہندو اچھے خاصے اثر و رسوخ کے حامل تھے۔ قیام پاکستان کے بعد قلعہ غضنفر گڑھ ایک بستی میں تبدیل ہو گیا اب یہ ایک موضع کہلاتا ہے اور یہ موضع خان گڑھ کے قریب سے شروع ہو کر وسندے والی تک چلا جاتا ہے۔

مول نہ و سرم ... میں غضنفر گڑھ کو آج تک نہیں بھولا!!!

غضنفر گڑھ سے ہجرت کرنے والے ہندو بیرسٹر جگدیش بترا کی اپنے شہر سے جڑی یادیں پروفیسر ڈاکٹر جے سی بترا ۱۹۳۸۱ء میں ضلع مظفر گڑھ کے علاقے قلعہ غضنفر گڑھ میں پیدا ہوئے، ۱۹۴۷ء میں انہوں نے اپنے خاندان کے ہمراہ ہندوستان ہجرت کی لیکن ان کا دل

کہیں غضنفر گڑھ کی ڈھنڈ میں ہی پڑا رہ گیا۔ ہندوستان جا کر ڈاکٹر جگدیش چندر بترا نے نامساعد حالات کے باوجود اعلیٰ تعلیم حاصل کی بیرسٹر بنے اور قانون کے مضمون میں ہی ڈاکٹریٹ کی ڈگری بھی حاصل کی، آج کل ڈاکٹر بترا سپریم کورٹ آف انڈیا کے سینئر وکیل ہیں۔ سرائیکی زبان اور اپنے شہر سے محبت ان کے خون میں شامل ہے، اسی زبان کی محبت انہیں کئی بار پاکستان کھینچ لائی۔ ہندوستان میں رہتے ہوئے بھی یہ سرائیکی زبان کے فروغ کے لیے کوشاں رہتے ہیں نہ صرف خود سرائیکی کے کہانی کار اور شاعر ہیں، سرائیکی دنیا کے نام سے ایک میگزین بھی شائع کرتے ہیں۔

ڈاکٹر جے سی بترا کی قائم کردہ تنظیم سرائیکی انٹرنیشنل دنیا بھر میں پھیلے ہوئے سرائیکیوں کو ایک لڑی میں پروتی ہے، ہندوستان میں لوگ انہیں سرائیکی زبان کے محسن کے طور پر جانتے ہیں، جے سی بترا ملتان اور دیگر شہروں کے سرائیکی شاعروں، ادیبوں اور صحافیوں سے بھی رابطے میں رہتے ہیں آیئے دیکھتے ہیں ڈاکٹر جے سی بترا قلعہ غضنفر گڑھ کو کس محبت سے یاد کرتے ہیں۔

میں اکتوبر ۱۹۳۸ء میں سائیں دلیپ چندر بترا اور سیئں گنیش بائی کے گھر غضنفر گڑھ ضلع مظفر گڑھ میں پیدا ہوا، میرا نام جگدیش چندر رکھا گیا۔ اس روز پورے ہندوستان میں دسہرا منایا جا رہا تھا، میری دو بڑی بہنیں سیتا بائی اور کنتی بائی بھی اپنے لالہ سائیں کے ساتھ دسہرا منانے کے لیے خان گڑھ گئی ہوئی تھیں۔ میری پیدائش پر خان گڑھ کے نواب زادہ نصر اللہ خان اور چودھری سادھو رام گت نے لالہ دلیپ چندر کو لاکھ مبارکیں دیں، سارے غضنفر گڑھ کے لوگوں ہندو و مسلمانوں نے مل کر خوشیاں منائیں، مولوی

ظہور الدین اعوان' کلو خان پٹھان' جال والے کے پیر سید شاہ اور ڈھیڈے لال کے پیر سائیں نے بھی دعائیں دیں، اس خوشی میں غضنفر گڑھ کی ڈھنڈ پر جوت جلائے گئے، مندر' گوردوارہ اور مسجد پر بھی چراغاں کیا گیا، لڈو اور مٹھائی تقسیم کی، دوسرے دن ڈھول تاشے بجائے گئے، جھومر ڈالی گئی' ہیجڑے بھی تانگے پر بیٹھ کر پہنچ گئے۔

دادا جی نارائن مل نے سب کو اپنی حیثیت کے مطابق خوش کیا، جب میں سوا مہینے کا ہوا تو اترا رامے سے ماموں گنیش داس اور نند لال ورمانی اونٹ کجاوا لے کر آ گئے، مجھے میری والدہ اور بہنوں کو اپنے گھر لے گئے' حضرت سخی سرور کے مزار پر لے جا کر میری جھنڈ اتروائی، مزار پر چادر چڑھائی، پھر اچ شریف لے گئے، پنجند وساخی کے میلے میں مجھے پانی میں ڈبکی لگوائی۔ میں غضنفر گڑھ میں اپنی گایوں' گھوڑوں اور بھینسوں پر بیٹھ کر بڑا ہوا، غضنفر کی ڈھنڈ پر روز اپنے یار دوستوں کے ساتھ ایک مقدس تیر تھ ہوتی تھی' مجھے کانے اور سریں کی کشتی پر بیٹھ کر پانی کی سیر اور تیراکی کرنے کا شوق چڑھ گیا تھا' پبن کے پھول' پبن کی ٹکیاں اور بھی میرے لئے کائنات کی سب سے خوبصورت چیزیں تھیں۔ میں جب پانچ سال کا تھا تو مجھے گورنمنٹ پرائمری سکول غضنفر گڑھ میں داخل کرایا گیا' یہ غالباً ۱۹۴۳ء کی بات ہے' مولوی ظہور الدین نے مجھ پہلا لفظ الف پڑھایا اور لکھنا بھی سکھایا' مجھ میں لکھنے پڑھنے اور شعر و شاعری کا شوق بھی مولوی ظہور الدین اور پنڈت رام کشن کھب نے پیدا کیا۔ ہمارے سکول میں کل ۲۲ طالب علم تھے جن میں ۱۲ مسلمان اور ۱۰ ہندو تھے۔ اردو میں مولوی ظہور الدین اعوان ماہر تھے اور سب کے ساتھ پیار سے پیش آتے تھے، مجھ سے تو بہت پیار کرتے تھے کیونکہ وہ میرے والد صاحب کے کلاس فیلو اور پکے دوست تھے، ان کے دو بیٹے رشید اور منیر اعوان بھی میرے ساتھ پڑھتے تھے۔ صادق خان

پٹھان مجھ سے خاصا بڑا تھا لیکن ہر جماعت دو سال میں مشکل سے پاس کرتا تھا، جے دیو' لدھا رام' چنی لال' ہری داس' اومی' گیان چند' ستیش اور منوہر بھی میرے سکول میں ہی پڑھتے تھے۔

غضنفر گڑھ ایک قلعہ تھا' نواب مظفر خان جو ملتان کے نواب تھے کے نام پر مظفر گڑھ شہر بسایا گیا' نواب مظفر خان کے چھوٹے بھائی نواب غضنفر علی خان کے نام پر غضنفر گڑھ اور ان کی بہن خان بی بی کے نام پر خان گڑھ آباد ہوا۔ ۱۸۱۸ء میں مہاراجہ رنجیت سنگھ نے ملتان پر حملہ کرکے صوبہ ملتان کو پنجاب کا حصہ بنا لیا تھا' ہمارے بزرگوں کو مہاراجہ رنجیت سنگھ نے اپنی فوج میں شامل کیا تھا، یوں اس جنگ میں ساتھ دینے کی وجہ سے غضنفر گڑھ ہمیں حصہ میں ملا تھا۔ ۱۸۴۸ء تک دیوان ساون مل اور اس کے بیٹے دیوان مولراج ملتان کے خود مختار حکمران رہے، ہمارے بزرگ بھی ان کے ساتھ حکومت میں شامل تھے۔ مولراج کو انگریزوں نے نواب بہاولپور کی مدد سے جنگ میں شکست دی اور لاہور کے قلعہ میں مولراج کو عمر قید اور کالے پانی کی سزا سنائی، مولراج بنارس میں دم توڑ گیا اور ہم لوگ انگریزوں کے غلام بن گئے، غلامی کی یہ زنجیریں ۱۹۴۷ء میں مہاتما گاندھی کی قیادت میں توڑی گئیں لیکن پاکستان بننے کی وجہ سے ہمیں ۱۹۴۸ء میں نواب لیاقت علی خان کے کنج پورہ ضلع کرنال میں مہاجر بن کر پناہ لینا پڑی۔

غضنفر گڑھ مجھے آج تک نہیں بھولا نہ ہی میں اپنی میٹھی بولی کو بھول سکا جسے اب سرائیکی کہا جاتا ہے۔ غضنفر گڑھ کے چار اطراف کھجور، آم اور اناروں کے باغ تھے، بہتے کنویں، نہریں، راوی، چناب اور سندھ کی لہریں، بھینس کی دم پکڑ کر دریا تیر کر پار کرنا، ڈیرہ

غازی خان کے قریب دریائے سندھ بڑے بیڑے پر پار کرنا، ملتان کی سیر، پرہلاد مندر، نرسنگھ اوتار مندر، زکریا کا مقبرہ، سورج کنڈ اور باغ لانگے خان لائبریری، ابھی تک آنکھوں کے سامنے نظر آتے ہیں۔ ہمارے بزرگ دکاندار اور زمیندار تھے بہت سادگی، محبت اور پیار سے خوش خوش رہ رہے تھے۔ اماں سیئں بھگوان کرشن کی بھگت لیکن والد صاحب روز گرو گرنتھ کا پاٹھ کرنے والے تھے۔ ماں گھر میں پیاز، لہسن' انڈہ، گوشت اور مچھلی استعمال نہ کرنے دیتی تھی، شراب بھی گھر میں رکھنا گناہ تھا، لالہ دلیپ چند کو کشتی کا شوق تھا۔

سفید پوش اور ملنسار تھے، کلاہ پٹکا ان کے لباس کا حصہ تھا، انگریز ڈپٹی کمشنر کو انہوں نے غضنفر گڑھ کی ڈھنڈ پر مرغابی کا شکار کرایا، میرے لئے پینٹ، کوٹ، ہیٹ اور بوٹ جرابیں لے کر آئے تھے، ان کا بیٹا پڑھ لکھ کر وکیل بنے یہ ان کی خواہش تھی اور رب نے ان کی یہ خواہش پوری بھی کی۔ ۱۹۴۶-۴۷ء کے زمانے میں حالات خراب ہو گئے تھے، غضنفر گڑھ کے کھتری سنار نیبھا رام اور کوڑا رام ملہوترا کی زمین پٹھا کلو خان میں نوابزادہ نصر اللہ خان کے ساتھ لگتی تھی، نہری زمین تھی نیبھا رام خوبصورت اور طاقت ور جوان تھا، مسلمانوں سے اس کی دوستی بھی تھی، کلو خان اسے بالکل اچھا نہ لگتا تھا، کلو خان نے ایک دن غصے میں نیبھا رام کا ناک کاٹ دیا جس پر اسے جیل ہو گئی، کلو خان جیل سے رہا ہو کر آیا تو اسی دن نیبھا رام بھی لاہور سے ناک کی پلاسٹک سرجری کرا کر آیا، بازار میں نیبھا رام نے کلو خان پر تیزاب کی بوتل انڈیل دی، میرے والد دلیپ چند پہلوان تو تھے ہی کلو خان کو اٹھا کر ڈھنڈ میں اتر گئے جس سے اس کی جان بچ گئی، کلو خان لالہ دلیپ چند کا احسان مند اور دوست بن گیا اور یہ دوستی تازندگی قائم رہی، تقسیم کے بعد بھی خط و کتابت

کا رشتہ بر قرار رہا، اب تک یہ رشتہ قائم ہے میرے دورہ پاکستان کے دوران سعید الرحمن خان، جہانگیر خان، لیاقت خان پٹھان والا سے مجھے ملنے کیلئے لاہور، ملتان، فیصل آباد، بہاولپور اور خان پور آتے رہے۔

غضنفر گڑھ کے چار طرف قلعہ کی کچی مٹی کی دیوار تھی، قلعے کے اندر صرف ہندو آبادی تھی، سارے مکانات چھوٹی پکی اینٹ کے بنے ہوئے تھے، ۱۹۴۸-۴۹ء میں انگریزوں کے ساتھ لڑائی میں دیوار گرا دی گئی، بہت سے ہندو بھی اپنے گھر چھوڑ کر بھاگ گئے تھے یا مار دیئے گئے تھے۔ مسلمان قلعہ سے باہر آباد تھے۔ زیادہ تر مسلمان غریب تھے، موچی، درزی، لوہار، درکھان، مستری، تانگے والے بھی اکثر مسلمان ہوتے تھے، ہندو اپنی کوئی خوشی مناتے تو ڈھول اور بین بجانے بھی مسلمان ہی آتے تھے۔ شادی کے مواقع پر سہرے، ڈوہڑے، کافیاں، گانے اور جھومر ڈالنے کیلئے بھی مسلمان ہوتے تھے۔ میرا دادا نارائن مل لمبی سفید داڑھی، سفید چولا، سفید پٹکا اور لنگ والی دھوتی پہنتا تھا، وہ سارے غضنفر گڑھ کا دادا تھا، ہندو مسلمان اور بستی کے سارے لوگ اسے دادا سائیں کہتے تھے، اپنی غمی اور خوشی میں اسے بزرگ سمجھ کر بلاتے تھے۔ اسے سب لوگوں کے ریت رواج کا پتہ تھا، ان پڑھ ہونے کے باوجود بہت سمجھ دار اور طاقت ور انسان تھا، سارے غضنفر گڑھ کا تو وہ کوتوال تھا۔ ایک بار چوروں نے نقب لگائی تو تین چوروں کو دادا سائیں نے فوراً پکڑ لیا ایک چور بھاگ گیا۔ ایک بار ہماری بھینس چوروں نے رات کو کھول لی، دادا سائیں اس کے پیر کے نشان سے کھوج لگا کر دریا سندھ کے پار سے بھینس لے آئے لیکن چور کو معاف کر دیا، چور ایک غریب مسلمان تھا جو سزا یافتہ بھی تھا، چوری اس کی مجبوری تھی کیونکہ اس کے گھر میں بچے بھوکے تھے، دادا جی نے چور کو ایک بوری گندم بھی دی۔ غضنفر

گڑھ میں ہولی کا تہوار دھوم دھام سے منایا جاتا تھا، رنگ لگانے کے ساتھ رنگیلی محفلیں بھی جمتی تھیں، قوال، گلوکار اور طوائفیں بھی بلائی جاتی تھیں، ایک بار نوابزادہ نصر اللہ خان بھی شامل ہوئے، ایک بڑی چارپائی پر رنگ دار چادر اور بڑا سرہانہ رکھ کر نیچے کھیس بچھایا گیا، سب ہندوئوں اور مسلمانوں نے نوابزادہ صاحب کو بڑی تہذیب کے ساتھ اس چارپائی پر بیٹھنے کی درخواست کی، نوابزادہ صاحب چارپائی پر بیٹھتے ہی زمین پر آرہے، سب نے کہا "ہولی ہے بھئی ہولی ہے" اور تالیاں بجائیں۔ نوابزادہ صاحب نے بھی اس مذاق کا برا نہ منایا ، چارپائی بغیر بان کی تھی، نوابزادہ نے سب گانے والوں کو انعام دیا اور رنگ بھی لگوایا، اس دور میں ٹاکی سینما صرف مظفر گڑھ میں تھا، گراموریکارڈ ایچ ایم وی کے ہوتے تھے، سریندر کور ان دنوں "چن کتھاں گزاری ہئی رات وے" لاہور ریڈیو سٹیشن سے اپنی سریلی آواز میں گا کر سارے وسیب میں معروف ہو گئی تھی، رام لیلا ہم ان دنوں روہیلانوالی یا آلو دے والی جا کر دیکھتے تھے۔

سن ۱۹۴۶ء میں پورنماشی کو چیتر کا مہینہ تھا، دادا نارائن مل نے اپنے بیٹے دیو رام کو ۲۰۰ گز دور سے آواز ماری، ہم سب کی نیند اکھڑ گئی، ہم نے سمجھا پھر کسی چور نے ہمارے گھر کو نقب لگائی ہے جا کر دیکھا تو وہ بڑا شانت تھا لیکن بڑے بڑے سانس لے رہا تھا، ہمیں تسلی دینے لگ پڑا اور کہا اب میں دنیا سے جا رہا ہوں میرے لئے تم رونا پیٹنا مت کرنا، صبح ڈھول تاشوں کے ساتھ میری ارتھی اٹھانا میری ارتھی کو سجا کر اس پر پھول اور پیسے نچھاور کرنا۔

سن ۱۹۴۷ء کی آزادی ۱۰ لاکھ بے قصور لوگوں کے قتل کی کہانی ہے جو بہت درد ناک اور انسان کو حیوان اور شیطان کے روپ میں دیکھنے کی کہانی بھی ہے۔ فرشتوں جیسے انسان مولوی ظہور الدین نے میرے والد دلیپ چند کو مشورہ دیا اپنی جائیداد کو چھوڑو' اپنا دھرم اور زندگی بچانے کے لئے غضنفر گڑھ کے لوگوں کو صاف بتا دو کہ ھندوستان چلے جائیں کیونکہ مہاجر جن کے ہاتھ میں حکومت آگئی ہے ھندو کو پاکستان میں نہیں رہنے دیں گے۔ یوں قتل عام' اللہ اکبر کے نعرے' لوٹ مار' اغواء' چوری' ڈاکے شروع ہو گئے اور پوری ھندو قوم نشانہ بن گئی۔ ڈھیڈے لال میں میری خالہ کی جوان لڑکی اغواء کرلی گئی، میرا خالو تھانے رپورٹ کرنے گیا تو قتل کر دیا گیا۔ ہمارے ماموں کو قتل کرکے دریائے سندھ میں بہا دیا گیا' ہم اپنے گھر کھلے چھوڑ کر جانوروں کو پٹھان والا کے کلو خان اور بطخوں کو جال والے کے پیر سید شاہ کو دے کر خان گڑھ آ گئے' اکتوبر ۱۹۴۷ء میں مظفر گڑھ سے گاڑی پکڑ کر نومبر میں جالندھر پہنچے' پھر کورکشیتر مہاجر کیمپ میں پناہ لی' میری چھوٹی بوا اور چھوٹے بھائی نے راستے میں ہی دم توڑ دیا' روٹی کے لالے پڑ گئے۔ دسمبر میں پتہ چلا کہ نواب لیاقت علی خان کنج پورہ کرنال کا قلعہ خالی کرکے کراچی پاکستان کے وزیر اعظم بن گئے ہیں' ہم پانی جھاگ کر کرنال سے پیدل کنج پورہ میں مسلمانوں کے خالی مکانات میں پناہ گزین ہوئے۔

شجاع آباد قلعہ:

بیرونی خطرات سے تحفّظ کے لیے شہر کے چاروں طرف ۱۷۶۷ء سے ۱۷۷۲ کے دوران قلعے اور اس کے چہار اطراف ایک مضبوط فصیل تعمیر کیے گئے۔ اٹھارہویں صدی میں تعمیر کیے گئے قلعے کی یہ فصیل اب بھی موجود ہے، جس کے چہار جانب بازار قائم ہیں۔ فصیل کا مرکزی حصّہ چاندنی چوک کہلاتا تھا، جس کا نام بعد میں تبدیل کر کے نصیر الدین شہید چوک رکھا گیا۔ ریلوے اسٹیشن کی طرف جانے والا راستہ ریلوے بازار اور دروازہ، ریلوے دروازہ کہلاتا تھا، اسی طرح محمد بن قاسم کا جہاں سے گزر ہوا، اس راستے کی جانب واقع بازار، ”ملتانی بازار اور اس بازار کے دروازے کو ”ملتانی دروازہ“ اور بابا رشید شاہ کے آستانے اور ان کی آخری آرام گاہ کی طرف نکلنے والا راستہ، ان کی نسبت سے ”رشید شاہ بازار“ اور دروازہ، ”رشید شاہ دروازہ“ کہلاتا تھا۔ جب کہ دریائے چناب کی جانب سے رات گئے تک آنے والے مسافروں کے لیے دریا کی طرف واقع بازار کے دروازے پر چار بڑے بڑے طاقوں میں روشنی کے لیے جو دِیے روشن کیے جاتے تھے، وہ آج بھی خستہ حال صورت میں قلعے میں موجود ہیں۔ ان چار طاقوں کی نسبت سے اس بازار کو ”چوطاقہ بازار“ اور دروازے کو ”چوطاقہ دروازہ“ پکارا جاتا تھا۔ بعد ازاں، ان دروازوں کے نام تبدیل

کر دیئے گئے اور خلفائے راشدین کے نام سے منسوب کر کے بابِ حضرت ابو بکر صدیقؓ، بابِ حضرت عمر فاروقؓ، بابِ حضرت عثمان غنیؓ اور بابِ حضرت علیؓ رکھ دیئے گئے۔ بیرونی حملوں سے تحفظ اور شہر کی حفاظت کے نقطہ نظر سے تعمیر کیے جانے والے اس قلعے کی قدیم فصیلیں امتدادِ زمانہ کے باعث شکستہ ہوتی چلی گئیں۔

کچھ عرصہ قبل ان قدیم و تاریخی فصیلوں کو مزید شکستگی اور معدوم ہونے سے بچانے کے لیے ایک شہری کی درخواست پر سپریم کورٹ آف پاکستان نے ازخود نوٹس لیتے ہوئے اسے اصل حالت میں برقرار رکھنے کے لیے خصوصی مرمّت کے احکامات جاری کیے، جس کے بعد کئی کروڑ روپے سے اس کی مرمّت کا کام کروایا گیا، لیکن کچھ عرصے بعد اس تاریخی ورثے کو پھر سے بے یار و مددگار چھوڑ دیا گیا۔ حالاں کہ حکومتِ پاکستان کی جانب سے فصیل پر آویزاں تختی پر واضح تحریر ہے کہ ”اسے تاریخی ورثہ قرار دے دیا گیا ہے۔ نقصان پہنچانے والے کے خلاف قانونی کارروائی عمل میں لائی جائے گی۔“ تاہم، افسوس کا مقام ہے کہ محکمہ آثارِ قدیمہ اور مقامی حکومت اس حوالے سے اپنا کوئی کردار ادا نہیں کر رہی، جس کے باعث آئے روز ارد گرد موجود گندگی و غلاظت اور کوڑے کرکٹ کے ڈھیر میں آگ لگنے کے باعث فصیل اپنی ہیئت اور اصل رنگت تقریباً کھو بیٹھی ہے۔ علاوہ ازیں، قلعے کے ارد گرد ”قبضہ مافیا“ بھی اس تاریخی وَرثے کو صفحۂ ہستی سے مٹانے پر تلی ہوئی ہے اور یہ صورتِ حال صرف قلعے یا فصیلوں ہی تک محدود نہیں، بلکہ نواب شجاع خان کے ”مظفر محل“ کی صورتِ حال بھی اس سے کچھ مختلف نہیں۔ وہ بھی بری طرح شکست و ریخت کا شکار ہے۔ جہاں کسی زمانے میں نواب شجاع کا خاندان مقیم تھا، اب وہاں جانور باندھے جا رہے ہیں۔ محل کی بیش تر قیمتی و نایاب اشیاء چوری ہوگئی ہیں، حتیٰ کہ قیمتی لکڑیوں سے تعمیر کردہ کھڑکیاں، دروازے اور روشن دان تک غائب ہیں اور اسی وجہ سے

محل کھنڈر کا منظر پیش کرنے لگا ہے۔ نیز، ملتانی بازار میں واقع یہ ''مظفر محل'' چوروں اور نشہ کرنے والوں کی محفوظ پناہ گاہ کی صورت بھی اختیار کر گیا ہے، جب کہ دوسری جانب نواب شجاع خان کے مقبرے کی حالت بھی فصیل اور محل سے کچھ زیادہ مختلف نہیں۔

قلعہ نندنہ:

قلعہ نندنہ کو یہ اعزاز بھی حاصل ہے کہ یہاں بیٹھ کر البیرونی نے تقریباً ایک ہزار سال پہلے زمین کا قطر ناپا جو اتنا درست تھا کہ آج جدید ترین آلات کے ذریعے جو پیمائش کی جاتی ہے اس میں اور البیرونی کی پیمائش میں صرف ۱۶ء۸ کلومیٹر کا فرق ہے۔ یہ قلعہ چوآسیدن شاہ سے بارہ میل مشرق کی طرف واقع ہے۔

قلعہ نندنہ کب بنایا گیا، اس حوالے سے شاہ نامہ اور ابو نصر کی تاریخ میں لکھا ہے کہ جب خلافتِ عباسیہ یا خلیفہ بغداد کے خلاف بلخ اور خراسان کے گورنروں نے بغاوت کا اعلان کیا تو غزنی پر بھٹی راجپوتوں کی حکمرانی تھی جن کے ماتحت تین صوبے اور چھ ریاستیں تھیں۔

سن ۹۵۶ میں سامانی حکمران عبدلمالک نے است پال عرف بھیم پال سے غزنی کا علاقہ چھین کر اسے ملک بدر کر دیا تو یہ چھوٹا لاہور اور ہنڈ کے مقام پر منتقل ہو گیا۔ جب سلطان محمود غزنوی اور سلطان کیو گوہر کے ہاتھوں است پال کو شکست ہوئی تو اس نے ہنڈ سے بھاگ کر ۹۷۱ میں کوہستان نمک کی بلند ترین چوٹی پر قلعہ بنوانا شروع کر دیا جو جے پال کے عہد میں مکمل ہوا۔ جے پال نے اس کا نام اپنے بیٹے انند پال کے نام پر نندنہ رکھا جو کہ ریاست بھاٹیہ کا صدر مقام تھا۔ اسی خاندان کے ایک راجہ ترلوچن پال جن کا سلطان محمود غزنوی کے ساتھ امن کا معاہدہ تھا لیکن اس کے بیٹے بھیم پال نے معاہدے کی خلاف ورزی کی جس پر سلطان محمود غزنوی نے ۱۰۱۳ میں قلعہ نندنہ پر چڑھائی کی لیکن راستے میں شدید برف باری کی وجہ سے اسے یہ مہم ۱۰۱۴ کے موسم بہار تک ملتوی کرنی پڑی۔ سلطان محمود غزنوی کے حملے کی خبر پا کر ترلوچن کشمیر کے راجہ سنگرامہاراجہ سے کمک حاصل کرنے کے لیے گیا مگر پیچھے اس کا بیٹا بھیم پال مزاحمت کرنے میں ناکام رہا اور میدانی علاقوں کی جانب فرار ہو گیا۔ یوں یہ قلعہ سلطان محمود کے قبضے میں آ گیا۔

تاریخ جہلم از انجم سلطان شہباز کے صفحہ ۲۶۶ پر درج ہے کہ اس قلعہ پر تین اہم ادوار گزرے ہیں۔ پہلے دور میں پنڈتوں نے اپنی بالادستی قائم کی اس دور میں یہاں مخروطی طرز کے مندر تعمیر کیے گئے اور تعمیر میں جو پتھر استعمال کیے گئے ان میں پیپل کے پتے کو نقش کیا گیا تھا۔ اس دور کے چند سکے بھی ملے ہیں جن میں پیپل کے پتے کا نشان ڈھالا گیا تھا۔

دوسرا دور راجہ جے پال کا تھا۔ اس دور کے مندر الگ الگ طرز تعمیر کے حامل ہیں جن میں شاہانہ انداز ملحوظِ خاطر رکھا گیا ہے۔ تیسرا دور سلطان محمود غزنوی کا ہے جس نے ۱۰۱۴ میں قلعہ نندنہ پر حملہ کیا اور سات دن کے بعد قلعہ کو فتح کر لیا۔ سلطان محمود غزنوی نے یہاں ایک عالیشان مسجد تعمیر کروائی جو فن تعمیر کا شاہکار مانی جاتی تھی۔ فتح کے بعد البیرونی نے قلعہ میں قیام کی اجازت چاہی جو سلطان نے منظور کر لی۔ البیرونی نے یہاں ایک رصد گاہ بنائی اور اس میں اس وقت کے سائنسی آلات نصب کیے جنہیں ہندو لوہے کی کمانیں کہتے تھے۔

کہتے ہیں کہ قلعہ نندنہ میں پانی کی قلت تھی اور پانی دور سے لایا جاتا تھا جس کی ذمہ داری شودروں کی تھی۔ پنڈتوں کا عقیدہ تھا کہ کوہستان نمک میں میٹھے پانی کا تمام ذخیرہ کٹاس راج کے نیچے ہے۔ ہندو دیومالا کے مطابق جب پاربتی دیوی نے خودکشی کر لی تو اس کے فراق میں شیو مہاراج کی آنکھوں سے پوتر پانی بہہ نکلا۔ دائیں آنکھ سے گرنے والے آنسو سے کٹاس کا تالاب بنا اور بائیں آنکھ کے آنسو سے اجمیر کے نزدیک پشکر کا چشمہ وجود میں آیا۔ یہ مقدس پانی ہندوؤں کے علاوہ کوئی استعمال نہیں کر سکتا تھا۔ جس پر البیرونی نے قلعہ کی چٹانوں کا مطالعہ کیا اور ایک چٹان کے نیچے کھدائی کروانی شروع کی تو ٹھنڈے میٹھے پانی کا دھارا بہہ نکلا اس پر پروہتوں نے البیرونی کو 'ودیا ساگر' کا خطاب دیا۔

ایک اور روایت یہ بھی بیان کی جاتی ہے کہ شودروں کے خاندان کی ایک لڑکی نے البیرونی کے ہاتھ پر اسلام قبول کیا تو اس کے خاندان والوں نے اسے زہر دے دیا جس

پر وہ کئی دن بے ہوش رہی البیرونی کے علاج سے جب وہ ٹھیک ہو گئی تو اس کے خاندان کے کئی افراد نے اسلام قبول کر لیا۔

وہاں ایک چشمے کا پانی قلعے سے ہوتا ہوا نیچے کی طرف آتا ہے جس سے پن چکیاں بھی چلتی ہیں۔ قلعے کے دونوں جانب بڑی بڑی چٹانیں ہیں۔ یہ قلعہ اپنے دور کا ایک شاہکار تھا جس کے صدر دروازے میں سرخ پتھر استعمال کیا گیا تھا جو سطح زمین سے ۲۵ فٹ بلند تھا اور ۱۸ فٹ چوڑا تھا جس کے آثار آج بھی موجود ہیں۔ کہتے ہیں کہ اس قلعہ سے ایک سرنگ قلعہ کسک تک جاتی تھی جو نندنہ سے چھ کلو میٹر کے فاصلے پر واقع ہے۔ ہو سکتا ہے یہاں کھدائی کی جائے تو اس سرنگ کا سراغ بھی مل جائے۔

نندنہ قلعے تک جانے کا راستہ جس قصبے سے گزرتا ہے وہ بھی نہایت تاریخی اہمیت کا حامل ہے۔ باغانوالہ نامی اس قصبے کے متعلق بیان کیا جاتا ہے کہ یہاں مغل بادشاہ جلال الدین اکبر نے شکار کھیلا اور ایک باغ لگوایا اسی دوران بادشاہ پر ایسی حالت طاری ہوئی کہ اس نے یہاں اپنے سر کے بال منڈوا دیے، جس کی تائید میں بادشاہ کے مصاحبین نے بھی ایسا ہی کیا۔ اکبر کا لگایا ہوا باغ بھی آج تباہ حال ہے مگر پہاڑوں سے بہتے ہوئے چشمے کی بدولت اس باغ کی تعمیر نو ممکن ہے۔

نندنہ کی بلند پہاڑی پر جانے کے لیے باغانوالہ سے ملحق برساتی ندی شیو گنگا سے گزرنا پڑتا ہے جس کے ارد گرد قدرت اپنے حسین نظاروں کے ساتھ جلوہ گر ہے۔ قلعہ کے آثار بھی مٹ رہے ہیں۔ کبھی یہاں پر آباد مندر سے گھنٹیوں کی آوازیں اور ساتھ ہی

واقع مسجد سے اللہ اکبر کی صدائیں بلند ہوتی تھیں۔ مگر اب یہ تمام صدائیں نندنہ کی تاریخ کی طرح خاموش ہو چکی ہیں۔

ستگھرہ قلعہ اوکاڑہ:

دریائے راوی کے کنارے واقع ستگھرہ قصبہ، پنجاب کے ضلع اوکاڑہ کے قدیم دیہاتوں میں سے ایک ہے۔ ستگھرہ نام کی زبانی روایات مختلف ہیں، مقامی لوگوں کا ماننا ہے کہ ست کا مطلب سات اور گھرہ کا مطلب گھر یا خاندان ہے، اور یہ وہ سات خاندان ہیں جو عظیم بلوچ لیڈر میر چاکرِ اعظم رند کے ساتھ اس علاقے میں آئے تھے۔ ستگھرہ کی وجہ شہرت ہی عظیم بلوچ سردار میر چاکر رند کا قلعہ اور مقبرہ ہے،

میر چاکر رند ۱۴۶۸ء میں پیدا ہوا اپنے والد شیحاک کی وفات کے بعد رند قبیلے کا سردار بنا۔ سردار بننے کے بعد میر چاکر رند کی ساری زندگی جنگ و جدل میں بسر ہوئی۔ دوسری جانب زیادہ تر لوگوں کا خیال ہے کہ اس علاقے کی سات بار تعمیر نو کی گئی، اسی لیے اس کا نام 'ستگھرہ' رکھا گیا۔ کچھ مؤرخین نے بیان کیا ہے کہ سکندر اعظم کے کچھ زخمی سپاہی (جن کا تعلق مقدونیہ کے قدیم قصبے سٹیجیرہ سے تھا) وہاں مقیم تھے اور انہوں نے اس قدیم قصبے کا نام سٹیجیرہ رکھا، جسے اب ستگھرہ کہا جاتا ہے۔

سن ۱۴۹۶ء میں میر چاکر رند نے سلطان شاہ حسین سے امداد حاصل کرنے کے لیے افغانستان کا سفر کیا جہاں اسے بہادری اور شجاعت کا ثبوت دینے کے لیے پاگل ہاتھی اور خونخوار چیتے سے لڑنا اور منہ زور گھوڑے پر سواری کرنا پڑی۔ وہ ان تمام آزمائشوں میں کامیاب ہوا۔ لاشاری قبیلے کے خلاف "۳۰ سالہ جنگ" کے اختتام پر ۱۵۱۹ء میں میر چاکر رند نے بلوچستان کو خیر آباد کہا اور ہجرت کرکے وسطی پنجاب میں آکر آباد ہوا۔ سبی سے آکر ستگھرہ میں آباد ہونے کی وجہ تو معلوم نہیں ہے لیکن ستگھرہ پہنچ کر بلوچ سردار نے

پرانے گائوں کے ساتھ نیا گائوں آباد کیا۔ اس کے ارد گرد عظیم الشان قلعہ تعمیر کیا۔ میر چاکر رند ۱۵۴۰ء میں یہاں خوشحال اور بااختیار زندگی بسر کر رہا تھا یہاں سے اس نے شیر شاہ سوری کی امداد کرنے سے انکار کیا اور اس کی فوج نے میر چاکر کے بیٹے شاہ داد کی کمان میں مغل بادشاہ ہمایوں کو تخت دہلی کے حصول میں مدد دی۔ ہمایوں نے انعام کے طور پر ستگھرہ سمیت ایک بہت بڑی جاگیر، گھوڑے اور غلام میر چاکر رند کے بیٹے کو دیئے۔ ۱۵۶۵ء میں میر چاکر رند نے وفات پائی اور یہیں پر دفن ہوا۔ اس کے ساتھ بلوچوں نے یہاں پر ایک عالیشان مقبرہ تعمیر کیا۔ ستگھرہ کا ایک اور مطلب سنسکرت کے لفظ ''سیتہ'' سے لیا جا سکتا ہے جس کا مطلب ہے ''سچ'' سنسکرت میں ستگھرہ کا مطلب ہوا سچائی کی سرزمین۔ ستگھرہ، ویسے بھی ایک قدیم تاریخی آبادی ہے جس کا ثبوت ایک اور تاریخی یادگار ہے جو آبادی کے مقابل سڑک کے دوسری طرف سب سے الگ تھلگ ایک ٹیلے پر پچھلے اور گزرے دنوں کی یاد میں خاموش اور غمزدہ سا کھنڈر ہے یہ کھنڈر چھوٹی اور پیلی پکی اینٹوں سے تعمیر کیے گئے ایک مینار کی عمارت کا ہے۔ میر چاکر کا تعمیر کرایا ہوا یہ قلعہ خاصا وسیع ہے دراصل یہ قلعہ کم اور فصیل زیادہ ہے یہ فصیل آبادی کی حفاظت کے لیے تعمیر کرائی گئی تھی۔ یہاں پہنچ کر سب سے پہلے گائوں سے باہر اونچی برجی دکھائی دیتی ہے جو قلعے کے ارد گرد ۱۵ میل کے علاقے میں خطرات پر نظر رکھنے کے لیے تعمیر کی گئی تھی۔ اس دور میں بھی مواصلات کا بسیط نظام وضع کیا گیا تھا۔ کسی خطرے کی صورت میں پہرہ دار برجی پر آگ جلاتا دوسری برجی سے آگ دکھائی دیتی تو وہاں بھی آگ جلادی جاتی۔ یوں آناً فاناً پورے علاقے میں خبر پھیل جاتی۔ برجی سے آج بھی دور دور تک علاقہ دکھائی دیتا ہے۔ ستگھرہ کا قلعہ بہت بڑا اور مضبوط تھا۔ اس کی ۲۵ فٹ اونچی دیوار بھی سارے

گائوں کا احاطہ کرتی تھی۔ جوں جوں گائوں کی آبادی بڑھتی گئی وہ قلعے سے باہر پھیلتا گیا۔ میر چاکر خان نے لمبی عمر پائی اور جب اس کا انتقال ہوا تو اس کی آخری آرام گاہ پر اس کے قبیلے والوں نے شاندار مقبرہ تعمیر کیا اور بہت عرصے تک مقبرے کی دیکھ بھال کی گئی لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ میر چاکر کے ساتھ آباد ہونے والے بلوچ خاندان رفتہ رفتہ ادھر ادھر کے علاقوں میں جانے لگے اور آج ان بلوچ قبائل کے نام لیوا پنجاب کے بیشتر علاقوں میں موجود ہیں۔ ہشت پہلو مقبرے کا جو حصہ ابھی موجود ہے وہ اس کی عظمت رفتہ کا پتہ دیتا ہے اب سے ۱۸۳ سال قبل رنجیت سنگھ نے ملتان جاتے ہوئے یہاں قیام کیا تھا اس کی فوجوں نے مقبرے کی چھت گرادی اور اس کے نقش و نگار کو برباد کردیا مقبرے کے اندر مٹی کی سات قبریں ہیں درمیانی قبر پر ایک چھوٹی سی تختی رکھی ہے۔ تو یہ ہے میر چاکر کا مقبرہ! وہ عظیم بلوچ سردار جس نے ہزاروں معرکوں کو سر کیا جس کی داستانیں رزمیہ نظموں اور گیتوں میں آج تک موجود ہیں

درحقیقت یہ قلعہ کم اور آبادی کی حفاظت کے لیے تعمیر کردہ فصیل زیادہ معلوم ہوتی ہے۔ بدقسمتی سے، مقامی لوگوں میں ناخواندگی یا ورثے کی اہمیت سے ناواقفیت کی وجہ سے، قلعہ بند دیواریں دن بدن خستہ حال ہوتی جارہی ہیں۔

قلعے سے دشمن پر نظر رکھنے کے لیے ۵۰۰ مربع فٹ کے پانچ برج بھی تعمیر کیے گئے، جہاں سے دور تک علاقے پر نظر رکھی جاتی تھی۔ ان میں سے تین برج قلعہ بند دیوار کے مشرقی جانب اور دو دیوار کی مغربی جانب ہیں۔ اس زمانے میں بھی مواصلات کا ایک وسیع نظام موجود تھا۔ قلعے میں تعمیر کردہ برجوں پر مامور کوئی پہرہ دار کسی بھی خطرے کی

صورت میں اگر ایک برج پر آگ جلاتا تو دوسرے برج سے یہ آگ نظر آتی تھی اور یوں خطرے کی خبر پورے علاقے میں پھیل جاتی تھی۔

مقامی لوگوں کی جانب سے توڑ پھوڑ اور ان برجوں کے غلط استعمال کی وجہ سے ان کی حالت کافی خراب ہو گئی ہے۔ قلعے کے ایک برج کو مقامی لوگ اپنے مویشیوں کے فارم کے طور پر اور بہت سے لوگ دوسرے برجوں کو اپنی رہائش گاہ اور کاروبار چلانے کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ خراب انفرااسٹرکچر کی وجہ سے برجوں کے بیرونی حصے کو بھی نقصان پہنچا جس نے ان کے مواد اور مضبوطی کو بھی متاثر کیا۔

ستگھرہ قلعہ مغل طرزِ تعمیر کی قدیم اور خوبصورت ترین مثالوں میں سے ایک ہے۔ ایک لاکھ ۶۰ ہزار مربع فٹ رقبے پر مشتمل اس قلعہ بند گاؤں کے ۲ مرکزی دروازے (جن کے لکڑی کے پینل اب موجود نہیں ہیں) قلعے کے درمیان میں واقع مرکزی بازار کی طرف لے جاتے ہیں، جو شمالی اور جنوبی برجوں کی سیدھ میں ہے۔ سڑکوں کا لے آؤٹ کافی پتلا اور نامیاتی ہے۔ یہاں مغل، سکھ اور برطانوی دورِ حکومت کے بہت سے تاریخی مکانات موجود ہیں۔

غالب امکان یہی ہے کہ یہ شہنشاہ اکبر یا پھر رنجیت سنگھ کے دور میں تعمیر کیے گئے تھے۔ قلعہ بند دیوار کے اندر مٹی اور اینٹوں کے مکانات کے جھرمٹ سے قدیم زمانے کو محسوس کیا جاسکتا ہے۔ کچھ گھروں میں افسانوی اور موضوعاتی دیواریں دیکھی جاسکتی ہیں۔ تاریخی ایوانوں کی موجودہ حالت اچھی نہیں ہے۔ مقامی باشندوں نے اپنی ضروریات کو پورا

کرنے کے لیے قلعے کے بہت سے تاریخی نوادرات کو نکال لیا۔ انھوں نے قلعہ بند دیواروں کے اندرونی حصے پر اپنے گھر تعمیر کر لیے تھے۔

قلعہ روات:

روات کا یہ قلعہ راولپنڈی سے شمال کی جانب ۱۶ کلو میٹر پر واقع ہے، راولپنڈی سے شمال کی جانب سفر کرتے ہوئے ۱۶ کلو میٹر کے فاصلے پر ایک گاؤں آتا ہے، جس کا نام روات ہے۔ روات کی اصل پہچان اس کا قلعہ ہے، جو جی ٹی روڈ کے دائیں جانب واقع ہے۔ قلعہ تک پہنچنا مشکل نہیں، اگر روات کے مرکزی بازار سے گزر کر پیچھے چلے جائیں تو یہ تاریخی عمارت نظر آتی ہے۔ اب تو روات ایک تاریخی تجارتی مرکز بن چکا ہے۔ دائیں بائیں دکانوں کا ایک جمگھٹا ہے اور قلعہ ان کے پیچھے چھپ کر رہ گیا ہے، روات کے نام کی بھی دلچسپ کہانی ہے۔ کہتے ہیں ‘اس کا نام رباط ہوتا تھا۔ عربی میں 'رباط‘ سرائے کو کہتے ہیں۔ وقت کے ساتھ بدلتے بدلتے اس کا نام روات ہو گیا۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ موجودہ قلعہ درحقیقت ایک قدیم کاروان سرائے تھا، جو جی ٹی روڈ کے ساتھ مسافروں کی سہولت یا سرکاری اہلکاروں کے ٹھہرنے کے لیے بنائی گئی تھی۔

اس کا فن تعمیر اس بات کی غمازی کرتا ہے کہ یہ قلعہ نما سرائے پندرہویں صدی کے اوائل میں سلاطین دہلی کے زمانے میں تعمیر ہوئی تھی۔ لیکن اس قلعے کو سلطان محمود غزنوی کے بیٹے مسعود کے ساتھ منسوب کیا جاتا ہے، جس کا زمانہ ۱۰۳۶ء ہے اور کہا جاتا ہے کہ اس کے لشکر کے باغی سپاہیوں نے اسے اس قلعے میں گرفتار کیا اور بعد میں ٹیکسلا کے نزدیک گڑی کے قلعے میں لے جا کر قتل کر دیا۔ یہ قلعہ بعد میں گکھڑ قبیلے کے سربراہ سلطان سارنگ خان کے قبضے میں آیا۔ یہ قلعہ سلطان سارنگ خان اور شیر شاہ سوری کے درمیان جنگ کی یاد بھی دلاتا ہے، جو اسی مقام پر لڑی گئی تھی۔

دراصل، پوٹھوہار کا گکھڑ قبیلہ مغلوں کا وفادار تھا اور ان کی جانب سے گاہے بگاہے شیر شاہ سوری کی فوج پر حملہ کیا جاتا رہتا تھا۔ سلطان سارنگ خان نے دورِ جلاوطنی میں مغل بادشاہ ہمایوں کی عسکری مدد کی تھی۔ ہمایوں کو شکست دینے کے بعد شیر شاہ سوری کی نظریں گکھڑوں کے علاقے کی جانب تھیں۔ لہٰذا سلطان سارنگ خان سے لڑنے کے لیے شیر شاہ سوری نے اپنے جرنیل خواص خان کی کمان میں ایک بڑا لشکر بھیجا۔ ادھر سلطان نے بھی مقابلے کے لیے اپنی فوجیں تیار کیں۔ روات کے مقام پر دونوں فوجوں کے درمیان خونریز جنگ ہوئی جس میں بالآخر سلطان سارنگ خان کو شکست ہوئی اور وہ اپنے سولہ بیٹوں سمیت میدان جنگ میں مارا گیا، جن کی قبریں روات کے قلعے میں ہی موجود ہیں۔

ھمایوں جب طویل جلاوطنی کے بعد واپس آیا تو اس نے پھروالہ قلعہ میں آدم خان کے پاس قیام کیا اور اس کے ساتھ اپنے دوستانہ تعلقات کی تجدید کی، فوج کو منظم کیا اور اپنی کھوئی ہوئی سلطنت دوبارہ حاصل کرنے میں کامیاب ہوا۔ آدم خان نے پوٹھوہار کا حاکم بنتے ہی سلطان سارنگ خان کے اعزاز میں ایک عالیشان ہشت پہلو گنبد والا مقبرہ تعمیر کروایا، جس کی تعمیر میں سنگِ مرمر اور دوسرے قیمتی پتھر استعمال کیے گئے تھے۔ تاہم، وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ لوگوں نے یہ سارے پتھر اکھاڑ لیے، جس کے بعد یہ اپنی تمام شان و شوکت کھو چکا ہے، تاہم اس کے در و دیوار اب بھی بہتر حالت میں ہیں۔ تاہم، حیران کن طور پر مقبرے کے اندر کسی قبر کا کوئی نام و نشان موجود نہیں ہے جبکہ سلطان سارنگ خان کی قبر بھی صحن میں ہے۔ اس قلعے کی ایک اور قابلِ دید چیز یہاں کی تین گنبدوں والی مسجد ہے، جو آج بھی آباد ہے اور قدیم دور کی یاد دلاتی ہے۔ کہتے ہیں کہ رنجیت

سنگھ کے دور میں یہ مسجد شدید بے حرمتی کا شکار ہوئی اور اس کی چھت اڑا دی گئی۔ بعد میں اہلِ رواات نے اس کی دوبارہ تعمیر کی۔ مسجد کے در و دیوار کی بربادی، ویرانی اور بے ثباتی کے باوجود اندازہ ہوتا ہے کہ یہ مسجد اپنے وقت میں فنِ تعمیر کا نادر نمونہ رہی ہو گی۔

اونچائی پر واقع ہونے کی وجہ سے یہ قلعہ دفاعی اعتبار سے انتہائی اہمیت کا حامل تھا۔ یہاں سے آس پاس کے وسیع علاقے پر موثر کنٹرول حاصل کیا جاتا تھا۔ چونکہ یہ قلعہ صرف فوجی اغراض و مقاصد کے لیے استعمال ہوتا تھا، اس لیے اس میں رہائشی عمارتیں نہیں ہیں۔ اس لحاظ سے یہ قلعہ اسی نوعیت کے دوسرے قلعوں سے مختلف ہے۔ قلعہ رواات مربع شکل میں پتھر سے تعمیر کیا گیا ہے، جس کی فصیل میں مشرق، شمال اور جنوب کی جانب تین دروازے بنائے گئے تھے۔ صدر دروازے کا رُخ مشرقی جانب ہے جبکہ عقبی دروازہ شمال کی طرف کھلتا ہے۔

یہ دونوں دروازے اپنی اصلی حالت میں موجود ہیں، تاہم ان کی محرابیں، طاق اور ڈاٹیں ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہیں جبکہ جنوبی دروازے کو پتھروں سے بند کر دیا گیا ہے۔ صدر دروازے سے کے دونوں جانب دو کمرے ہیں، جن میں پہرے دار رہا کرتے تھے۔ قلعہ کی فصیل ۳۰ فٹ بلند رکھی گئی تھی، جس کے اندر چاروں اطراف میں حجرے بنے ہوئے ہیں۔ صدر دروازے کے مشرق، شمال اور جنوب میں بیس بیس حجرے تعمیر کیے گئے تھے، جو دفاعی لحاظ سے اہمیت کے حامل تھے بلکہ اس جگہ کے ماضی کے کاروانوں کی آرامگاہ ہونے کی نشاندھی بھی کرتے ہیں۔ قلعے کی بعض دیواروں، محرابوں، ڈاٹوں، طاقوں اور گنبدوں میں چھوٹی اینٹیں لگی ہوئی ہیں۔

قیام پاکستان کے بعد قلعہ کو محکمہ اوقاف کی نگرانی میں دے دیا گیا تھا۔ قلعے کے ارد گرد مضبوط فصیل جو کسی زمانے میں اسے بیرونی دشمنوں سے تحفظ فراہم کرنے کا ذریعہ تھی، اب ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہے۔ روات کے باسیوں نے بھی اس کی دیواروں کو نقصان پہنچایا۔ انھوں نے اپنے گھر تعمیر کرنے کے لیے قلعے کی دیواروں کو گرایا، تاہم بعد میں حکومت نے دیواروں کے ارد گرد تعمیرات پر پابندی لگا دی۔

قلعے کے دونوں اطراف میں بنائے گئے خوبصورت لان بھی زبوں حالی کا شکار ہیں ۔ قلعہ روات دیکھنے کے لیے ملکی اور غیر ملکی سیاحوں کا آنا جانا لگا رہتا ہے۔ آجکل یونیسکو کے تعاون سے قلعے کی بحالی کا کام جاری ہے۔ اس تاریخی قلعے کی بحالی پر بھرپور توجہ دے کر اسے سیاحت کے لیے حوصلہ افزا مقام بنایا جا سکتا ہے۔

قلعہ اسلام گڑھ:

صحرائے چولستان میں منفرد طرز تعمیر کا شاہکار قلعہ اسلام گڑھ اپنے اندر چار صدیوں کی تاریخ سموئے ہوئے ہے

صحرائے چولستان میں ضلع رحیم یار خاں کی تحصیل خانپور کے مشرق میں اس قلعے کی تعمیر ١٦٦٥ء میں راجہ راول نے بھیم ور کے نام سے کروائی تھی۔ تاہم، ١٧٦٦ء میں اختیار خان مندھانی جو گڑھی اختیار خان کا سردار تھا، اس نے قلعہ فتح کر کے اس کا نام تبدیل کر کے اسلام گڑھ رکھ دیا۔ انہوں نے قلعہ کے اندر پختہ کنواں اور ایک مسجد بھی تعمیر کروائی تھی۔ یہ قلعہ پاک بھارت سرحد کے بالکل قریب (١٠کلومیٹر دور کی دوری)

واقع ہے۔ ۱۹۶۵ء اور ۱۹۷۱ء کی پاک بھارت جنگ کے دوران یہ قلعہ گولہ باری کا بھی نشانہ بنا۔ قلعے کی فصیل پر بنے برجوں کی تعداد اور سائز مختلف ہیں۔ فصیل کی اونچائی ۴۵ فٹ تک ہے اور چوڑائی ۱۰ سے ۱۲ فٹ ہے۔

ہر ملک و قوم اپنے آثار قدیمہ پر فخر کرتی ہے کیونکہ یہ ان کی تاریخ کی ایک علامت سمجھتی جاتی ہے لیکن پاکستان میں چار سو برس پرانے اس قلعے کو محفوظ کرنے کی ذمہ داری کسی بھی ادارے پر نہیں ہے۔ ملک میں سیاحت کو فروغ دینے کے لیے ہزاروں پر کشش اور تاریخی مقامات میں سے ایک مقام چولستان کا بھی ہے

قلعہ بجنوٹ:

یہ قلعہ بہاولپور شہر سے ۱۶۳ کلو میٹر دور اور نواں کوٹ قلعہ سے ۴۵ کلو میٹر کے فاصلے پر ہے۔ ماہرین کے مطابق اس کی تعمیر میں مقامی چونے کا پتھر استعمال ہوا ہے۔ اس قلعے کو گولائی میں چاروں اطراف سے ۳۰۰ فٹ تک پھیلایا گیا تھا۔ اس کے شمالی حصّے کی طرف ۱۱ فٹ چوڑا داخلی دروازہ ہے اور تین کمرے اس کے اوپر بنائے گئے تھے۔ قلعے کی دیواریں ۲۱ فٹ تک بلند رکھی گئی تھیں۔ مقامی لوگوں کے مطابق قلعے کے ۴ بڑے اور ۲ چھوٹے برج تھے جن پر جانے کے لیے سیڑھیاں موجود تھیں۔ ایک برج مکمل طور پر مسمار ہو چکا ہے جب کہ باقی ۱۳ انتہائی خستہ حالت میں ہیں اور اب تقریباً ڈھیر ہو چکے ہیں

اس تک پہنچنے کا دوسرا راستہ بھاولپور سے تقریباً ایک سو پچانوے کلو میٹر براستہ چنن پیر سے ہے جس میں تقریباً پچپن کلو میٹر پکی سڑک اور باقی ایک سو چالیس کلو میٹر کچا راستہ ہے جس پر کئی جگھوں پر ریت کے ٹیلوں کے انبار موجود ہیں، رحیم یار خان سے یہ قلعہ تقریبا ۱۵۰ کلو میٹر پر ہے، اس قلعہ کا پہلا نام قلعہ ونجھروٹ تھا، یہ قلعہ راجہ ونجھا نے تعمیر کرایا تھا۔

تاریخ مراد کی مطابق ۵۷۴ھ / ۱۱۷۸ھ میں اس قلعہ کو شہاب الدین غوری نے مسمار کرادیا تھا لیکن کرنل ٹاڈ کیمطابق یہ قلعہ ۷۵۷ھ میں راجہ کہڑ کے لڑکے تنو نے تعمیر کرایا تھا۔

یہ قلعہ مدتوں تک کھنڈرات کی حالت میں پڑا رہا پھر ۱۱۷۱ھ / ۱۷۵۷ء میں موریا داد پوترہ نے اس کی از سر نو تعمیر کرائی۔ ۱۷۵۹ھ میں علی مراد خان نے یہ قلعہ حاصل کر کے اسکی مرمت کرائی دو سو سال تک یہ قلعہ مرمت کے بغیر پڑا رہا اس قلعہ کی زیادہ

شکستہ حالی کا سبب پاکستان و بھارت کی ۱۹۷۱ کی جنگ ہے جب بھارت کے جنگی طیاروں نے اپنی خفت مٹانے کے لیے اس قلعے پر شدید بمباری کی اور اپنی عوام کو مطمئن کرنے کی کوشش کی کہ ہم نے پاکستان کی چیک پوسٹ کو تباہ کیا ہے مگر یہ جھوٹی افواہ تھی۔

قلعہ دین گڑھ:

قلعہ دین گڑھ کسی زمانہ میں یہ مقام ترہاڑ کہلاتا تھا، اب دین گڑھ کہلاتا ہے۔ یہ قلعہ بہادر خان ہلانی نے ۱۷۵۷ء میں تعمیر کرایا تھا۔ یہ قلعہ تحصیل صادق آباد میں چولستان کی جانب ۲۳ میل کے فاصلے پر واقع تھا۔ اس قلعہ کو پتن منارا سے راستہ جاتا تھا۔ دراصل جیسلمیر کے ایک ہندو راجاللو نے اس مقام پر قلعہ ترہاڑ بنایا تھا۔ دوسری روایت کے بموجب محمد معروف خان کہرانی کے بیٹے ابراہیم خان نے ۱۷۶۵ء میں اس کی تعمیر شروع کرائی اور اس کے چچا زاد خدا بخش ولد نور محمد خان نے اس کو مکمل کریا۔ داخلی دروازے کے اوپر لکڑی پر کلمہ طیبہ کے علاوہ کچھ اور بھی تحریر کیا تھا۔ قلعہ کی فصیل اور مکانات سب منہدم ہو چکے ہیں۔ اس کی بلند فصیل کے کچھ حصے عمر رفتہ کو آواز دیتے رہتے ہیں۔ قلعہ دراوڑ سے اس کا فاصلہ تقریباً ۵۲ کلومیٹر اور یزمان شہر سے ۲۱ کلومیٹر ہے۔

قلعہ موج گڑھ:

قلعہ موج گڑھ ، یہ قلعہ صحرائے چولستان میں فورٹ عباس اور یزمان کے درمیان واقع ہے۔ یہ قلعہ بہاول پور سے یزمان، فورٹ عباس روڈ پر ۷۰ کلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہے۔ مٹی اور اینٹوں سے بنا ہوا یہ قلعہ معروف خان کرانی نے ۱۷۴۳ء میں تعمیر کروایا تھا۔ یہ قلعہ انڈیا، پاکستان کے باڈر کے بالکل قریب ہے۔ قلعہ موج گڑھ بھاول پور کے عباسی دور میں بنائے گئے قلعوں میں سے ایک قلعہ ہے۔ یہ قلعہ بھی اپنی تباہی کی آخری منزلوں پر ہے اور حکومتی اداروں کی توجہ کا طلب گار ہے۔ یہ قلعہ پکی اینٹوں سے تعمیر کیا گیا

تھا، اس کی فصیل بہت بلند ہے۔ قلعہ کی خوب صورت مسجد اور معروف خان کا مقبرہ دیکھنے کے قابل ہے۔ قلعہ کے مشرق میں تالاب ہے جو سوکھا پڑا ہے۔

قلعہ خان گڑھ:

یہ قلعہ نواب محمد بہاول خان دوم نے ۱۷۸۳ء میں تعمیر کروایا تھا۔ یہ قلعہ نصف دائرے کی شکل میں تعمیر کیا گیا ہے۔ جس کے ہر کونے میں چوترے ہیں اور مشرق والی سمت میں داخلی دروازہ ہے۔ ہر طرف سے یہ قلعہ ۱۲۸ فٹ تک پھیلا ہوا ہے۔ یہ قلعہ کچی اینٹوں سے تعمیر کیا گیا تھا، مگر فصیل کے کچھ حصے اور اس کا داخلی دروازہ نہ تھا۔ اس کے میناروں اور برجوں میں بھی عمدہ مصالحہ اور ماوند بڑی سائز کی اینٹیں استعمال کی گئی تھیں۔ اس کی دیواریں مٹی کی اینٹوں کی بنی ہوئی ہیں جو کہ کافی مد تک گر چکی ہیں۔ یہ قلعہ دراور قلعہ سے ستر کلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہے۔ اس قلعہ کی تمام دیواریں اور فصیل وغیرہ مسمار ہو چکی ہیں۔

قلعہ نواں کوٹ:

لیہ کے آثار قدیمہ پر ریسرچ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ چوبارہ تحصیل سے بجانب شمال تقریباً ۱۸ کلو میٹر کے فاصلے پر قدیمی قصبہ نواں کوٹ کے نام سے ایک قدیمی آبادی نظر آتی ہے۔ جس کی قدامت کا اندازہ اس قلعہ سے لگایا جا سکتا ہے اس قلعے کو بھی سید خضر خان نے تعمیر کرایا تھا۔ یہ بھی مٹی کا بنا ہوا تھا اسے بھی رنجیت سنگھ نے تباہ کیا تھا۔ قلعے کے واضح آثار آج بھی دکھائی دیتے ہیں یہ علاقہ بہت قدیم تھا۔ یہاں سے کافی قدیم سکے، بدھ مت کی مورتیاں، سکے، بت مٹی کے ظروف مٹی کے کوہان والے ہیل، اونٹ ملتے ہیں۔ یہ بھی مٹی کی بھی اینٹوں کا بنا ہوا ہے۔ اس کا کل رقبہ پرچوں کے اندر تک ۱۵۶ فٹ تک ہے۔ اس کا داخلی دروازہ ۱۸ فٹ چوڑا تھا۔

قلعہ جام گڑھ:

قلعہ جام گڑھ خوبصورت جلی ہوئی اینٹوں سے تعمیر کیا گیا ہے، جن میں سے اکثر اب بھی اپنی اصل شکل میں موجود ہیں۔ قلعہ میر گڑھ سے ۹ کلو میٹر کے فاصلے پر واقع اس قلعے کو ۱۷۸۸ء میں جام خان معروفانی نے تعمیر کروایا تھا۔ یہ قلعہ مربع شکل کا ہے اور اس کا مربع ہر طرف سے ۱۱۴ فٹ ہے۔

قلعے کی دیواریں ۲۸ فٹ اونچی ہیں جبکہ کونوں پر گول گڑھوں سے مضبوطی فراہم کی گئی ہے۔ قلعہ کے مشرق میں ۹ فٹ کا گنبد نما گیٹ ہے۔ اس میں ایک داخلی دروازہ اور چار مینار تھے جبکہ اندرونی صحن میں ایک کمرہ تھا۔

قلعہ پھولڑا:

یہ ایک قدیم قلعہ ہے اور کسی زمانے میں دیکانیر کے راجہ پکانے تعمیر کرایا تھا۔ اس قلعہ کی بیرونی دیواری تمام تر یکی اینٹوں سے بنی ہوئی تھیں اور دونوں دیواروں کے درمیان کا حصہ مٹی سے بھرا ہوا تھا۔ اس کو دھوڑا کہتے ہیں، تاکہ گولہ باری سے قلعہ کو نقصان نہ پہنچے۔ قلعہ کے اندر مغربی حصے میں ایک کنواں ہے، ۱۸افٹ گہرا اور چار فٹ قطر میں تھا۔ قلعے کے چاروں کونوں پر مینار ہیں، جن کے درمیان میں رہائشی کمرے تھے۔ شمال مغربی مینار پختہ اینٹوں کا بنا ہوا تھا۔ جوبی حصے میں ایک سہ منزلہ عمارت تھی، جو بہت خوبصورت اقامت گاہ تھی۔ اس اقامت گاہ کی پیشانی پر لکھا ہوا تھا: ”مالک ایں محمد اکمل خاں داؤد پوتر ار مضان المبارک ۱۱۴۴ھ۔ قلعہ کے باہر بھی تین کنویں تھے، مگر ان کا پانی کھارا تھا۔ یہ قلعہ بہاول پور سے مشرق میں بیکانیر کی سمت واقع ہے، قلعہ کے اوپر تین توپیں بھی تھیں

قلعہ مبارک پور:

نواب مبارک خان نے ۱۱۵۷ء میں شہر فرید کے نزیک (موجودہ چشتیاں) ایک قلعہ تعمیر کرایا تھا۔ اس کا نام قلعہ مبارک پور رکھا تھا، یہ قلعہ کچھی مٹی (دھوڑ) کا بنا ہوا تھا۔ اس کی دیواریں بہت بلند تھیں، قلعہ کے شمالی جانب پہلا دروازہ تھا۔ میں کے اوپر ایک پختہ سہ دری اور یہ گلہ بنا ہوا تھا، اندر رہائشی مکانات تھے۔ اب یہاں صرف مٹی کے چیلے ہیں اور قلعہ کھنڈر میں تبدیل ہو چکا ہے۔ یہ قلعہ دراصل کویر اور جوئیہ وفات کے شورش اور بغاوت کرنے والے در ساروں سے مقابلے کیلئے تعمیر کیا گیا تھا۔ نواب بہاول خان دوم

نے قلعہ کے اوپر توپ رکھوادی تھی۔ ۱۰۰۸ء تک قلعہ پر رکھی رہی، جس پر ایک پینل کی پلیٹ تھی پر یہ تحریر کندہ تھی: سرکار رکن الدولہ، نصرت جنگ، سیف الملک محمد بہاول خان بہادر عباسی، ۱۲۱۷ھ۔

قلعہ فتح گڑھ:

سن ۱۷۹۹ء میں نواب محمد بہاول خان دوم نے گوادینا کے مقام پر ایک قلعہ تعمیر کرایا۔ یہ مقام موجودہ بہاول نگر گوادینا میں امروکا ریلوے اسٹیشن سے ۱۵ میل شمال مغرب میں واقع تھا۔ یہ قلعہ باہر سے پکا تھا مگر اندر سے دیواریں کچی تھیں۔ قلعہ کے اندر ایک گھر کنواں اور باہر دو پکے کنویں بنے ہوئے تھے، جو بارش کے پانی سے بھرتے تھے۔ اٹھارویں صدی کے آخری دنوں تک یہاں فوج رہا کرتی تھی۔ اس کا نگہبان ہمیشہ داؤد پوترا ہوتا تھا۔ اب یہ قلعہ منقود ہو چکا ہے۔ اس کی ایک چھوٹی سی بستی ہے، جہاں عربانی ذات کے لوگ رہتے ہیں۔

قلعہ ٹبہ جیجل:

ضلع بہاول نگر میں حاصل ساڑھو سے چند میل کے فاصلے پر یہ قلعہ موجود ہے۔ قدیم زمانے میں یہ ایک زبردست دفاعی قلعہ تھا، جو وقت کے ہاتھوں اب ایک ٹبہ وہ گیا ہے بیکانیئر کی سرحد پر واقع ہونے کی وجہ سے گمان ہوتا ہے کہ قدیم زمانے میں بھی یہاں سے حملے ہوتے رہے۔ اس قلعہ کے ساتھ دریا بہتا تھا، اب یہاں دور دور تک دریا کے آثار نہیں ہیں۔ یہ قلعہ پختہ اور خام اینٹوں سے بنایا گیا تھا اور اینٹیں بڑے سائز کی تھیں۔ راجہ اس قلعہ میں موسم برسات میں آکر قیام کرتا تھا اب یہاں کچھ بھی نہیں ہے۔

قلعہ خیر گڑھ:

یہ قلعہ اختیار خان کے بیٹے ساجی خان نے ۱۷۷۵ء میں تعمیر کرایا تھا اور اس کا نام قلعہ خیر گڑھ رکھا۔ یہ قلعہ دفاعی وجوہات کی بناء پر تعمیر ہوا تھا۔ تمام قلعہ کچی اینٹوں سے بنا ہوا تھا۔ اس قلعہ کے اندر ایک پکا تالاب اور پر صحن میں رہائشی مکانات تھے، ان میں کچھ پکے بھی تھے۔ قلعہ کی فصیل کے کچھ حصے پکے تھے۔ داخلی دروازہ تھا، جس کے اوپر رہائشی حصہ تھا۔ یہ قلعہ گول شکل میں ہے اور چاروں طرف سے ۷۰ فٹ تک اندر کی طرف پھیلا ہوتا ہے۔ جس کے چاروں طرف آٹھ پہلو برج ہیں۔ یہ قلعہ دراوڑ قلعے سے تقریباً ۶۰ کلومیٹر کی دوری پر واقع ہے۔ یہ قلعہ امتداد زمانہ کے علاوہ پانی کی کمی کی وجہ سے ویران ہوا۔ پھر آہستہ آہستہ مرمت نہ ہونے کی وجہ سے منہدم ہو گیا اور اب صرف ایک ڈھیر سے زیادہ نہیں ہے۔

قلعہ بہاول گڑھ:

نواب محمد بہاول خان دوم اٹھارویں صدی کے آخر میں جب حکمران بنے تو انہوں نے ریاست بیکانیر کی سرحد پر دفاعی لحاظ سے مسافرانوالہ کے مقام پر ایک قلعہ تعمیر کرایا تھا۔ بہاول پور گزیٹر ۱۹۰۴ء کے مطابق یہ قلعہ ۱۷۹۱ء میں تعمیر کر لیا تھا۔ اس قلعہ کے قریب ایک باغ دس بیگ زمین میں لگایا گیا۔ یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ چولستان کے اس باغ میں کس قسم کے پودے لگائے گئے اور ان کے لیے پانی کا کیا انتظام کیا گیا تھا۔ نواب دوم کے زمانے میں پہلے یہ جگہ دفاعی چوکی تھی، پھر یہ قلعہ تعمیر ہوا۔ یہ قلعہ انیسویں صدی کے

آخری ایام تک منہدم ہو چکا تھا اور اس کا ملبہ کسی دوسری جگہ لے جایا گیا۔ ۱۸۷۰ء میں جب یہ قلعہ مسمار کیا گیا تو اس ہ میں ہزاروں کی تعداد میں بڑے بڑے توپ کے گولے برآمد ہوئے۔ غالباً یہ وہ ذخیرہ تھا جو اس قلعہ میں دفاعی اہمیت کے پیش نظر جمع کیا گیا تھا۔ اب یہاں سوائے مٹی کی ڈھیریوں کے اور کچھ نظر نہیں آتا۔

قلعہ سردار گڑھ:

نواب مبارک خان نے ۱۷۶۳ء میں ولہر کا علاقہ ریاست بیکانیر سے پٹہ پر لیا اور ولہر کے قلعہ کے کھنڈرات پر ایک قلعہ کی تعمیر شروع کر دی۔ بیکانیر کے راجہ سنگھ نے ان کو منع کیا، جب نواب صاحب نے انکار کر دیا تو ایک آفیسر بنام سردار مول چند پر ہیلا کو بھیج کر ولہر کو واپس لے لیا۔ نواب صاحب نے خیر محمد خان مہرونان پر جانی اور اکرم خان اربانی کو ایک فوج لے کر بھیجا۔ جنگ ہوئی پیکانیر والے بھاگ گئے تھے اور ولہر کا قلعہ نواب صاحب کے پاس مستقل آ گیا۔ نواب مبارک خان نے اس قلعہ کا نام سردار گڑھ رکھا اور اپنی ریاست میں شامل کر لیا۔ یہاں ایک کنواں کھدوایا پھر دوسرا مگر دونوں کا پانی کھارا نکلا۔ یہ قلعہ بیکاییر سرحد سے صرف ڈھائی میل کے فاصلے پر ہے۔ ۱۸۶۶ء میں یہاں تین توپیں نصب تھیں، جن میں ایک پیتل کی تختی پر لکھا تھا: "مھراجہ دھیرج، مھراجہ سری زور اور سنگ میو سمبت ۱۷۹۷۔ اس کتبے سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ توپ بیکانیر کی تھی، یہ توپ بعد میں بہاول پور لائی گئی تھی۔

قلعہ مچھکی:

یہ قلعہ لال خان صوبہ دار نے ۱۷۷۷ء میں ایک قدیم ٹیلے پر تعمیر کر دیا تھا۔ لال خان صوبہ داری اختیار خان مندھانی کا بڑا بیٹا تھا۔ یہ اختیار خان وہ تھا جس نے گڑھی اختیار خان آباد کی تھی۔ اس قلعہ قدیم کے اندورنی وبیرونی سے سب کچے تھے۔ یہ قلعہ دراوڑ سے تقریبا تیئس میل کے فاصلے پر بہ سمت مشرق واقع تھا۔ مگر جلد ہی پانی کی کمیابی کی وجہ سے منہدم ہو گیا اب یہاں سوائے مٹی کی ڈھیروں کے کچھ بھی نہیں ہے۔

قلعہ قائم پور:

یہ قلعہ خیر پور ٹامے والی سے دس میل شمال کی جانب واقع ہے۔ اس کو قائم خان عربانی نے ۱۷۴۷ء میں آباد کیا تھا۔ اس زمانے میں دریائے ستلج کا اس جانب رخ نہ تھا، بلکہ قائم پور کے ساتھ شمالی جانب تھا۔ جب یہ آباد ہوا تو اس کا نام گوٹھ قائم خان تما، جہاں اس وقت شہر آباد ہے۔ اس کے مشرقی سمت ایک قلعہ تعمیر کرایا گیا تھا۔ اس قلعہ کی فصیل پختہ اور بلند تھی، دمدمے بہت مضبوط تھے۔ چاروں جانب اونچے برج تھے، جہاں سپاہی پہرہ دیتے تھے۔ یہ شہر کسی زمانے میں ریاست بہاول پور کا اہم مقام تھا۔ اب قلعہ منہدم ہو چکا ہے۔

قلعہ مرید والا:

اختیار خان کے دوسرے بیٹے حاجی خان نے ۱۷۷۷ء میں ایک قلعہ مرید والا کے مقام پر تعمیر کر لیا تھا۔ یہ قلعہ بھی قلعہ دراوڑ سے پاکستان میں یہ سمت جنوب ۲۵ میل کے فاصلے پر آباد تھا۔ یہ قلعہ تمام تر کچی مٹی کا بنا ہوا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ یہ قلعہ زیادہ عرصہ آباد

نہ رہ سکا اور ۱۸۰۵ء میں دریائے ہاکڑہ میں سیلاب آیا تو سیلاب میں گر گیا اور جلد ہی بالکل نابود ہو گیا۔ یہاں پر اب سوائے مٹی کے ڈھیریوں کے کچھ نظر نہیں آتا۔

قلعہ چانڈہ کھانڈہ:

قدیم زمانے میں یہ قلعہ دراوڑ سے دو میل کے فاصلے پر ایک ٹیلے پر آباد تھا۔ تاریخ سے صرف یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ قلعہ سکندر اعظم کے حملے کے وقت موجود تھا۔ سندھ جاتے ہوئے سکندر اعظم نے چانڈہ کھانڈہ کے مقام پر اس زمانے میں دریا سندھ یا دریائے ہاکڑہ کی مشہود بندر گاہ تھی میں قیام کیا اور یہیں سے دریا عبور کیا تھا۔ کرنل ٹاڈ نے وقائع بیکانیر پر لکھا ہے کہ سکندر سندھ جاتے وقت دراوڑ کے قریب ایک ایسے مقام پر پہنچا جو بھٹیز سے ۲۵ میل جنوب میں تھا۔ یہ بھیٹز اس وقت دھاوندوسر بھی کہلاتا تھا۔ یہاں ایک محل بنام رنگ محل تھا، جہاں حکمران رہتا تھا۔ اب اس قلعے کے کھنڈرات بھی موجود نہیں ہیں۔ قیاس ہے کہ اس قلعہ کے ملبہ اور مصالحہ سے قلعہ دراوڑ کی تعمیر اور مرمتیں ہوتی رہیں۔

قلعہ رکن پور:

اس قلعہ کے آثار دین گڑھ سے ۳۲ میل کے فاصلے پر مغرب کی جانب موجود ہیں۔ محمد معروف خان کہرانی نے ۱۷۷۶ء میں اس قلعہ کو تعمیر کرایا تھا۔ یہ قلعہ تمام تر مٹی سے تعمیر کیا گیا تھا۔ اس قلعہ کے اندر رہائشی اندر مکانات تھے۔ مکانات اور میناروں کے اب آثار رہ گئے ہیں۔ یہ قلعہ غوث پور بھی کہلاتا ہے۔

قلعہ کنڈیرا:

قدیم ٹیلے پر ۱۷۴۶ء میں بھکر خان جانی کے بیٹے فضل خان پیر جانی نے موجودہ منٹھار تحصیل صادق آباد سے تھوڑے فاصلے پر یہ قلعہ تعمیر کرایا تھا۔ اب اس قلعہ کی باقیات بھی غائب ہو گئی ہیں، صرف کھنڈرات باقی ہیں۔ اس قلعہ کی چار دیواری پختہ تھی، فصیل اور برجوں میں پختہ اینٹیں استعمال کی گئی تھیں۔ اس کے چار بڑے بلند مینار تھے، فصیل کے درمیان میں ایک دروازہ تھا۔ ۱۸۰۵ء میں نواب محمد بہاول خان دوم نے اس قلعہ کو سیاسی نقطہ نظر کے تحت مسمار کر دیا تھا۔ اس قلعہ کے ارد گرد چولستان کے مہر قبائل آباد ہیں۔ اب یہاں ٹیلوں کے سوا کچھ باقی نہیں ہے۔

قلعہ سیوراہی:

تحصیل صادق آباد کے قصبہ سنجر پور سے مشرقی سمت ایک میل کے فاصلے پر نہر کے کنارے قلعہ سیوراہی آباد ہے۔ یہ ان چھ قلعوں میں سے ایک ہے، جو رائے سہائی نے تعمیر کرائے تھے۔ رائے سہائی کا عہد چھٹی صدی عیسوی کا ہے۔ اس کی باہت صرف یہ معلوم ہوتا ہے کہ شاہ حسین ارعون نے ۱۵۴۵ء میں اسے تباہ کر دیا تھا۔ جنرل کنگھم کے مطابق یہ وہی مقام تھا، جسے سکندر اعظم کے عہد کے مورخین نے سوگڈیا کو محل قرار دیا تھا۔ اس قلعہ کے ڈھیروں میں کبھی کھدائی کا کام نہیں ہوا۔ اس کے باوجود متعدد بار یہاں بڑے بڑے توپ کے گولے برآمد ہوئے ہیں۔

قلعہ صاحب گڑھ:

یہ قلعہ ۱۷۷۷ء میں فضل علی خان ہلانی نے تعمیر کر لیا تھا۔ فضل علی خان ہلانی رحیم یار خان کا بانی تھا۔ اس قلعہ کے در و دیوار کی مٹی کے بنے ہوئے تھے، مگر بیرونی دیواروں کے ساتھ پختہ اینٹیں لگائی گئی تھیں۔ اس قلعہ کو نواب بہاول خان دوم نے جو فضل علی خان ہالانی کے داماد تھے ۱۸۰۵ء میں قلعہ مسمار کرا دیا تھا۔ قلعہ کے اندر کوڑے خان ولد خدایار خان کی رہائش تھی، وہ بھی مسمار کرا دی گئی۔ قلعہ کے باہر ایک تالاب میں بارش کا پانی جمع ہوتا تھا، جو انسانوں اور جانوروں کے کام آتا تھا۔ یہ قلعہ صاحب گڑھ کے کھنڈرات رحیم یار خان سے ۶۷ میل کے فاصلے پر جنوب میں چولستان میں موجود ہے۔

قلعہ ونجھروٹ:

اس قلعہ کو راجہ ونجھہ یا بجا بھاٹیا نے ۷۵۷ء میں تعمیر کروایا تھا۔ ۱۱۷۸ء میں اس قلعہ کو شہاب الدین غوری نے مسمار کرا دیا تھا۔ یہ قلعہ مدتوں تک کھنڈرات کی حالت میں پہلا رہا پھر ۱۷۵۷ء میں موریا داد پوترہ نے اس کی از سر نو تعمیر کرائی۔ ۱۷۵۹ء میں علی مراد خان نے یہ قلعہ لے کر مرمت کرائی۔ دو سو سال تک یہ قلعہ مرمت کے بغیر پڑا رہا۔ آخر کار منہدم ہو کر تباہ ہو گیا، اب یہ قلعہ اب کھنڈرات کی صورت میں موجود ہے، مگر پھر بھی یہ اپنی شاندار حالت کو بیان کرتا ہے۔ یہ قلعہ نواں کوٹ قلعہ سے ۴۵ کلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہے۔ اس قلعہ کو بنانے میں چونے کا پتھر استعمال ہوا ہے، جو مقامی طور پر پایا جاتا ہے۔ یہ قلعہ گول صورت میں ہے، جو چاروں طرف ۳۰۰ فٹ تک پھیلا ہوا ہے۔ شمال کی طرف

۱۱ فٹ چوڑا داخلی دروازہ ہے، جس پر ۳ کمرے بنے ہوئے ہیں۔ اس کی دیواریں ۲۱ فٹ تک بلند ہیں۔ بہاولپور سے اس کا فاصلہ ۱۶۳ کلومیٹر ہے۔

قلعہ دھویں:

یہ قلعہ دراوڑ سے چولستان میں ۳۲ میل کے فاصلہ پر تعمیر کیا گیا تھا۔ یہ ایک دفاعی قلعہ تھا، جو کبیر خان اچرانی کے بیٹے فاضل خان نے ۱۷۷۶ء میں تعمیر کرایا تھا۔ یہ قلعہ بالکل کچی مٹی کا تھا، اس قلعہ کی فصیل کچھی دھوڑ کی بنائی گئی تھی، تاکہ مورچوں کے گولوں سے فصیل برباد نہ ہو سکے۔ انیسویں صدی کے شروع میں یہ قلعہ منہدم ہو چکا تھا، اب اس قلعہ کے آثار بھی موجود نہیں رہے۔

قلعہ اوچ:

یہ علاقہ قبل از مسیح میں بھی آباد تھا اور یہاں راجہ ہود حکومت کرتا تھا۔ جس کے نام پر یہ جگہ مشہور ہوئی، پھر بگڑ کر یہ جگہ ہوچ کہلانے لگی اور اب اوچ کہلاتی ہے۔ کہتے ہیں کہ یہ شہر ۷۷ء میں تباہ ہو گیا تھا۔ سکندر نے اپنے حملوں کے دوران اس کو فتح کیا تھا۔ چچ نامہ میں ہنری ایلیٹ کے مطابق اس کا نام اسکلندہ تھا۔ سکندر کے وقت سے لے کر انگریزوں کے اس ملک میں قدم رکھنے تک کوئی نہ کوئی بادشاہ یہاں حملہ کرتا رہا اور اس شہر کو تباہ کرتا رہا۔ اوچ کے مخدوم محمد حامد گنج بخش سے نواب صاحب کی ان بن ہو گئی اور انہوں نے بغاوت کر دی۔ نواب محمد بہاول خان دوم نے ۱۸۰۴ء میں مخدوم محمد حامد کو گرفتار کر لیا اور اوچ فتح ہو گیا اور قدیمی قلعہ مسمار کر دیا گیا۔ اب یہاں سوائے ٹیلہ کے کچھ باقی نہیں ہے۔

قلعہ تاج گڑھ:

رحیم یار خان سے ۴ میل کے فاصلہ پر واقع تھا۔ کسی زمانے میں اس کا نام ہرار تھا۔ دسویں صدی ہجری میں یہاں رانی ہران حکومت کرتی تھی جو جیسلمیر کے راجہ کی بیٹی تھی۔ اس نے اپنے نام پر اس قلعہ کی تعمیر کرائی تھی۔ ایک مسلمان بزرگ سعید احمد بلوری نے رانی کو مسلمان کیا۔ قلعہ تاج گردہ جو قدیمی ہرار تھا، مدت تک سمرا خاندان کے راجاؤں کے قبضہ میں رہا۔ پھر جیسلمیر کے راجاؤں کے قبضہ میں آگیا۔ پھر بھاٹیہ خاندان اس میں رہائش پذیر رہے۔ ۱۸ ویں صدی عیسوی کے آخر میں فصل علی نے اس قلعہ کو مسمار کرادیا اور ۱۷۸۰ء میں اپنے بھائی تاج محمد خان کے نام پر اس مقام کا نام تاج گڑھ رکھ دیا۔ حالاں کہ تاج گڑھ دراصل داؤدپوتروں نے بنایا اور بسایا تھا۔ مگر گزیٹر بہاولپور ۱۹۰۴ء کے مطابق یہاں اب کوئی پوترہ نہیں رہتا ہے۔

قلعہ موءمبارک:

رحیم یار خان سے دس کلو میٹر کے فاصلے پر مومبارک کا قدیم قلعہ موجود ہے۔ شمال مغرب میں اب بھی کئی جگہ پر فصیل کے حصے نمایاں نظر آتے ہیں اور پچاس ساٹھ فٹ مٹی کے ڈھیر کو اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہیں۔ یہ قلعہ راجہ ساہنس نے اپنی ماں کی رہائش کے لیے بنایا تھا۔ اس عہد کو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا ہم مصر خیال کیا جاتا ہے۔ اس نے اپنی ماں کے نام پر اس جگہ کا نام ماؤ رکھا تھا۔ کبھی قلعہ کے بیس برج تھے اور چار دمدمے تھے، فصیل پختہ اور مضبوط تھی۔ مدتوں بعد اسی خاندان کے ایک راجہ کیلاش نے اس کو مرمت کرایا تھا۔ سلطان محمود غزنوی نے اپنے حملوں کے دوران اس قلعہ کو فتح کیا اور اس

کو مرمت کرایا تھا۔ ۱۵۶۹ء میں سلطان حسین ارغون نے پھر اس قلعہ کو فتح کر لیا۔ چھٹی صدی ہجری میں حضرت شیخ حمید الدین حاکم جو حضرت شاہ رکن عالم کے خلیفہ خاص تھے اس جگہ کو اپنی رہائش کیلئے منتخب کر لیا اور یہاں کے ہزاروں خاندانوں کو مسلمان کیا۔ انتقال کے بعد آپ کے جسد خاکی کو یہیں سپرد کر دیا گیا۔

قلعہ لیارا:

سن ۱۷۸۰ء میں اس قلعہ کی تعمیر سبزل نے کرائی تھی۔ یہ وہی خان خان تھے جنہوں نے کوٹ سبزل نام کا شہر موجودہ صادق آباد بسایا تھا۔ ایک اور روایت کے مطابق اس قلعہ کی تعمیر سبول خان کہرانی نے ۱۷۵۶ء میں کرائی تھی۔ اس قلعہ کی باقیات کوٹ سبزل سے چولستان کی جانب ۲۴ میل کے فاصلے پر موجود ہیں۔ یہ قلعہ بنیادی طور پر کچا تھا اور فصیل کے کچھ حصے اور قلعہ کا دروازہ پکی اینٹوں سے بنائے گئے تھے۔ یہ قلعہ ایک قدیم ٹیلے پر تعمیر کیا گیا تھا۔ اس کے باوجود ۱۸۰۹ء میں دریائے سندھ یا دریائے ہاکڑہ کے سیلاب میں یہ بری طرح متاثر ہوا اور آہستہ آہستہ مسمار ہوتا چلا گیا۔

کسک قلعہ چکوال:

تاریخ کی ورق گردانی سے معلوم ہوا کہ یہ قلعہ، ملوٹ قلعہ کے حکمران راجہ مل خان جنجوعہ کے صاحبزادے راجہ جوہد نے علاقائی سالمیت کے پیش نظر تعمیر کروایا تھا۔ دراصل یہ سارا علاقہ جو خطہ پوٹھوہار اور کوہستان نمک پر مشتمل ہے، ایران، افغانستان اور وسط ایشیا سے آنے والے حملہ آوروں کے لیے اولین گزرگاہ کے طور پر استعمال ہوتا رہا۔

اس لیے یہاں کے مقامی راجے اور سلطان ہمیشہ بیرونی حملہ آوروں کی ہنگامی آمد کے خدشات سے دوچار رہے۔

کہا جاتا ہے کہ ۱۲۹۰ء میں جلال الدین فیروز شاہ خلجی نے پہلی دفعہ اس قلعے پر حملہ کیا اور اس خطے کو اچھا خاصا نقصان پہنچایا۔ خلجی کے جانے کے بعد جنجوعوں کو اس علاقے میں اپنی ساکھ بحال کرنے میں کافی وقت لگا۔ ۱۳۹۸ء میں ایک دفعہ پھر ایک نئی افتاد کا سامنا کرنا پڑا جب امیر تیمور آن وارد ہوا۔ خیر اس وقت کا راجہ بڑا سیانا نکلا، اس نے امیر تیمور کو دلی تک کا رستہ دکھانے کی شرط پہ جان بخشی پائی۔ چھوٹے موٹے حملہ آور بھی وقتاً فوقتاً نازل ہوتے رہے مگر یہ جنجوعہ راجے ان کا دلیری سے شکار کرتے رہے۔

۱۸۱۰ء میں جب مہاراجہ رنجیت سنگھ پنجاب میں پنجے گاڑ چکا تو یہاں کے جنجوعوں کی سرکوبی کو نکلا، کہتے ہیں کہ چھ ماہ اس نے اس قلعہ کسک کا محاصرہ کیا مگر کسی طور یہاں کے سلطان فتح محمد خان کو شکست نہیں دے سکا۔ محصوری کے وہ چھ ماہ ریاست کسک کے باسیوں کے لیے بہت خوفناک ثابت ہوئے اور خوراک اور پانی کی قلت کے باعث بالآخر سلطان فتح محمد خان کو سمجھوتہ کرنا پڑا۔ اس سمجھوتے کے تحت سلطان اپنے اہل و عیال کے ہمراہ انڈیا کے ایک دوسرے علاقے ہارنپور منتقل ہو گیا اور بالآخر دو تین دہائیوں بعد سلطان کی موت کے بعد اس کے اہل و عیال دوبارہ اسی ریاست کسک کے قرب و جوار میں آ بسے اور لہڑ سلطان پور گاؤں بسا لیا۔ اس وقت اس خاندان کی چشم و چراغ مہوش حیات خان سلطانہ ہیں جو کہ صوبائی اسمبلی میں اپنے علاقے کی نمائندگی بھی کر چکی ہیں

سطح سمندر سے تقریباً تین ہزار فٹ کی بلندی، بلکل عمودی طرز کے ایسے پہاڑ پر جو ٹیلہ نما ہو اور اس کے اوپر پیدل پہنچنا ہی جان جوکھوں کا کام ہو۔ تیرہ ایکڑ رقبے پر محیط اس پہاڑی چوٹی پر بنایا گیا قلعہ کسک کسی حیرت کدہ سے کم نہیں۔ ایک ایسے پہاڑ پر جہاں اوپر چڑھنا بھی مشکل ترین کام ہو، بنا کسی جدید مشینری کے بھاری بھاری پتھروں سے اس قلعے کے گرد نہ صرف دیوار بنانا بلکہ پورا قلعہ تیار کرنا شائد اہرام مصر کی طرح عجوبہ ہی کہا جا سکتا ہے۔ قلعے کے گرد بنائی گئی دیوار کی لمبائی کم و بیش ۳۷۰ فٹ ہے۔ جو اگرچہ ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو چکی ہے مگر اب بھی کئی جگہ دیکھی جا سکتی ہے۔ مکمل طور پر پہاڑ کی چوٹی پر بنے ہونے اور اس کی چوٹی تک رسائی میں مشکلات کے باعث دفاعی نقطہ نظر سے ایک شہکار کہا جا سکتا ہے۔ جہاں دو اطراف سے گہری کھائی اور مغرب کی جانب کُسک گاؤں اور شمال کی جانب سے اس قلعے تک رسائی کا مرکزی راستہ تھا۔

اس قلعے پر بارش کے پانی کو ذخیرہ کرنے کے لیے دو تالاب بھی بنائے گئے تھے جن کے آثار ابھی بھی باقی ہیں۔ بارہویں صدی سے ہی اس پر بیرونی حملہ آوروں نے حملے شروع کر دیے، جلال الدین فیروز شاہ خلجی نے اس کی ابتدا کی اور رنجیت سنگھ کے دور میں اسے فتح کر کے یہاں کے حکمرانوں کو علاقہ بدر کر دیا جو پنڈ داد نخان کے گاؤں ہرن پور میں جا کر آباد ہوئے مگر یہ قلعہ اس کے بعد زوال کا شکار ہوتا چلا گیا۔ کُسک گاؤں کے ایک بزرگ کے مطابق انگریز دور حکومت میں کسک قلعے کی مرمت وغیرہ کا کام کیا جاتا تھا مگر انگریزوں کی رخصتی کے ساتھ ہی یہ قلعہ تیزی سے کھنڈرات میں بدل گیا۔

اگر اس قلعے کی چوٹی تک رسائی کے لیے سیڑھیاں بنا کر اسے سیاحتی مقام کا درجہ جاتا تو بلاشبہ چکوال کے سیاحتی مقامات میں ایک شاندار اضافہ ہوتا۔ اگرچہ خوبصورت اور پر فضا مقام پر بنے اس قلعے سے دور دراز علاقوں کا منفرد نظارہ اپنی مثال آپ ہے۔ مگر ہر گزرتے دن کے ساتھ یہ قلعہ اب کھنڈرات میں بدلتا جارہا ہے

سنگنی قلعہ:

سنگنی کا قدیم قلعہ گجر خان سے ۲۵ کلو میٹر مغرب میں سوئی چیمیاں کے دریا پر واقع ہے۔ یہ قلعہ جسے قیدیوں کو رکھنے کے لیے استعمال کیا جاتا تھا، اس کے بارے میں مانا جاتا ہے کہ اسے مغلوں نے تعمیر کروایا تھا اور بعد میں اس پر کشمیر کے ڈوگروں اور سکھوں نے قبضہ کر لیا تھا۔

سنگھنی قلعے کی تعمیر کے حوالے سے متضاد آراء پائی جاتی ہیں، کچھ کا خیال ہے کہ یہ قلعہ مغلوں نے تعمیر کروایا تھا، جس پر بعد میں ڈوگروں نے قبضہ کر لیا تھا جبکہ بعض روایات کے مطابق اسے کشمیر کے ڈوگروں نے بنوایا تھا۔ اس حوالے سے کہتے ہیں کہ جب یہ علاقہ ۱۸۱۴ء میں مہاراجہ رنجیت سنگھ کی حکمرانی میں آیا تو سنگھنی کے مقام پر اس قلعے کی تعمیر کا فیصلہ کیا گیا تاکہ نا صرف علاقے کو کنٹرول کیا جاسکے بلکہ ٹیکس وصولی میں بھی سہولت ہو۔ اس طرح سکھ دورِ حکومت میں اس قلعے کا کردار دفاعی سے زیادہ انتظامی تھا۔ پنجاب پر انگریزوں کے قبضے کے بعد اس قلعے کو جیل کیمپ کے طور پر استعمال میں لایا گیا

بلند فصیلوں کے حامل اس قلعے کے تین اطراف قدرتی خندقیں کھدی ہوئی ہیں، جن میں پانی بہتا ہے۔ تاہم، ایک جانب سے ہریالی کے بیچوں بیچ چلتا پگڈنڈی نما راستہ قلعے کے اندر داخل ہونے کے لیے استعمال ہوتا ہے اور لوگوں کو وہاں سے قلعے تک پہنچنے میں کوئی دشواری نہیں ہوتی۔ ۲۰۰ سال کا عرصہ گزر جانے کے باوجود قلعے کے دروازے پر ابھی تک چیک پوسٹیں قائم ہیں۔ قلعہ کا مرکزی دروازہ مشرق کی طرف سے کھلتا ہے، جہاں

سے ٹکل گاؤں دیکھا جا سکتا ہے۔ یہیں سے سیڑھیاں اُوپر قلعے کے اندر لے جاتی ہیں۔ اس کو تعمیر کرنے میں پہاڑی پتھر کا استعمال کیا گیا ہے۔

سنگھنی قلعے میں پانچ برج ہیں، جن میں اوپر جانے کے لیے سیڑھیاں موجود ہیں۔ کونوں پر تعمیر شدہ چاروں برج ایک ہی سائز کے ہیں جبکہ پانچواں برج قدرے چھوٹا ہے۔ یہ برج قلعے کی حفاظت اور اور گردونواح پر نظر رکھنے کے لیے استعمال کیے جاتے تھے۔ قلعہ کی دیواروں میں کہیں کہیں دراڑیں نظر آتی ہیں مگر مجموعی طور پر اس کی دیواریں آج بھی اچھی حالت میں ہیں۔ ان دیواروں میں بے شمار روشندان بنے ہوئے ہیں جبکہ ہوا کی آمدورفت اور بندوق سے نشانہ لگانے کے لیے سوراخ بھی بنے ہوئے ہیں۔

قلعہ کے صحن کے ایک کونے میں فرش میں چوکور سوراخ موجود ہے، جہاں سے نیچے نہر بہتی ہوئی نظر آتی ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ اس سوراخ کو نیچے بہتے پانی کو قلعے میں لانے کے لیے استعمال کیا جاتا تھا۔ قلعہ کے نیچے موجود نہریں گرمیوں کے موسم میں تیراکی اور ٹھنڈک کے لیے ایک بہترین جگہ مہیا کرتی ہیں کیونکہ سورج کی روشنی یہاں تک نہیں پہنچتی۔ یہاں آنے والے لوگ ان نہروں میں نہاتے ہیں۔ اس قلعے میں کوئی خاص عمارت، بیٹھک، دیوان یا محل نہیں ہے کیونکہ اسے تعمیر کرنے کا مقصد محض علاقے پر اپنا اثرورسوخ برقرار رکھنا تھا۔ اس لیے اگر یوں کہا جائے کہ یہ ایک قدیم زمانے کی پولیس چوکی ہے تو کچھ غلط نہ ہو گا۔ سپاہی وغیرہ غالباً قلعے کے برجوں کے اندر ہی قیام پذیر رہتے ہوں گے۔

قلعے کے اندر داخل ہوتے ہی سامنے صحن اور صاحبزادہ عبدالحکیم کا مزار نظر آتا ہے، جہاں زائرین کی آمدورفت کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ صاحبزادہ عبدالحکیم ڈوگرا راج کے دوران ایران کے راستے عراق سے یہاں دین کی تبلیغ کرنے آئے تھے۔

ڈوگرا سپاہیوں نے انہیں سنگھنی میں داخل ہونے نہیں دیا تھا کیونکہ یہ علاقہ اس وقت ریاست آزاد جموں و کشمیر کے ڈوگروں کے زیرِ تسلط تھا۔ انہیں علاقہ بدر کر کے چکڑالی میں رہنے پر مجبور کیا گیا، جہاں کئی لوگ ان کے مرید بن گئے، ان کا نام دیگر علاقوں میں پھیلتا چلا گیا اور وہ پوٹھوہار ریجن کے تمام علاقوں میں مشہور و معروف ہو گئے۔ ان کی وفات کے بعد ان کے مریدوں نے مزار تعمیر کیا جو پوٹھوہاری طرزِ تعمیر کی ایک اعلیٰ مثال ہے۔

اس میں داخل ہونے کے لیے تمام سمتوں سے تین محرابی دروازے تعمیر کیے گئے ہیں۔ مزار ماربل سے تعمیر کردہ ہے، اس کی تعمیر اور نقش و نگاری میں انتہائی مہارت کا مظاہرہ کیا گیا ہے۔ مزار پر ایک گنبد اور اس کے کونوں پر چار مینار تعمیر کیے گئے ہیں۔ گنبد کی بنیاد کو کاشی کے کام والی ٹائلز سے سجایا گیا ہے۔ مزار کا گنبد قلعے کی فصیل کے اوپر سے نظر آتا ہے۔ راہداری کی دیواروں پر جدید سیرامکس کا استعمال کیا گیا ہے جبکہ مزار کے اندرونی حصے کو شیشے کے کام سے سجایا گیا ہے۔ ٹائلوں اور شیشے کا کام مزاروں کے جدید پوٹھوہاری طرزِ تعمیر کا بنیادی جزو ہے۔ صاحبزادہ عبدالحکیم کے مریدوں نے مزار کے بالکل قریب ایک مسجد بھی بنوائی تھی۔ مزار اور قلعے کا خیال صاحبزادہ عبدالحکیم کے عقیدت مند رکھتے ہیں۔

منگلا فورٹ:

یہ وہ جگہ ہے جہاں دریاء جہلم کی قدرتی حد پنجاب اور کشمیر کو تقسیم کرتی ہے، اس مقام سے ۳۲۶ قبل مسیح میں یونانی بادشاہ سکندر اعظم نے دریائے جہلم عبور کیا اور منگلا سے دس میل دور کھڑی کے مقام پر قیام کرنے کے بعد مہاراجہ پورس کی افواج سے اپنی تاریخی لڑائی لڑی تھی۔

منگلا قلعہ کی ایک تاریخی روایت یہ ہے کہ ۳۲۶ء قبل مسیح میں یونانی بادشاہ سکندر نے منگلا کے مقام سے دریا عبور کر کے کھڑی کے میدان میں قیام کر کے راجہ پورس کی فوجوں سے جنگ کی۔ اس جنگ کے بعد جب راجہ پورس مارا گیا تو راجہ پورس کی بیٹی منگلا نے کھڑی میں شوالک پہاڑی سلسلے کی آخری پہاڑی پر اپنی رہائش گاہ بنائی اور منگلا دیوی کے نام سے مشہور ہوئی۔ بعد میں اس جگہ پر مٹی کا ایک بڑا قلعہ تعمیر کیا گیا۔ منگلا ایک خوبصورت، عمدہ اور اچھے اخلاق کی مالک خاتون تھی۔ جب سکندر سے جنگ کے بعد راجہ پورس مارا گیا تو اس کی بیٹی منگلا دیوی نے اس اونچی پہاڑی پر اپنی رہائش گاہ کو خانقاہ بنالیا اور خود وہ سنت اور

جوگن بن گئی۔ وہ ایک بااخلاق خاتون تھی جو خوبصورت گیت گا کر اپنے آباواجداد کا احوال بیان کرتی تھی۔ لوگ دور دراز سے انھیں دیکھنے اور ان کے خوبصورت گیت سننے کے لیے آتے تھے۔ اس دوران ان کے ہزاروں چاہنے والے بھی سنت بن گئے۔ دور دراز سے بادشاہ ان کو دیکھنے اور برکت حاصل کرنے آتے تھے۔ رفتہ رفتہ منگلا دیوی ایک عظیم سنت بن گئی۔ ایک متھ یہ بھی ہے کہ منگل کا دن ان کے درشن کے لیے منتخب کیا گیا، لوگ منگل کو ان کے درشن کرنے ان کے پاس آتے تھے، اس طرح آہستہ آہستہ منگل کے دن کی مناسبت سے ان کا نام منگلا دیوی پڑ گیا۔

ایک اور تاریخی روایت کے مطابق دیوی منگلا کا نام ہندو مذہب کی مشہور کتاب مہابھارت میں مذکور ہے۔ یہ ان قدیم کتابوں میں سے ایک ہے جو قبل مسیح کے دور میں لکھی گئی تھی۔ ایک اور روایت کے مطابق منگلا دیوی کا تذکرہ کتاب الہند میں موجود ہے جو البیرونی نے گیارہویں صدی میں ہندوستان کے دورہ کے بعد لکھی تھی۔ البیرونی ایک مشہور مورخ اور ریاضی دان تھے جو ۱۰۲۰ء میں ہندوستان پر سلطان محمود غزنوی کے حملے کے وقت اس کے ساتھ تھا۔ اپنے اس سفر میں اس نے منگلا دیوی کا مجسمہ دیکھا تھا۔ میں نے کتاب الہند کے اردو ترجمہ کا بغور مطالعہ کیا ہے لیکن منگلا دیوی کا ذکر اس میں کہیں بھی نہیں ملا۔

ایک تیسری تاریخی روایت یہ کہتی ہے کہ منگلا قلعہ قبل مسیح میں تعمیر کیا گیا تھا۔ منگلا قلعہ میں ایک مندر تھا۔ اس مندر میں ہندو مذہب کے بڑے دیوتا شیو کی مورتی تھی۔ یہ مجسمہ چار فٹ لمبے اور دو فٹ موٹے پتھر پر بنایا گیا تھا جو مندر کے درمیان میں نصب تھا۔

یہ اتنا وزنی تھا کہ بیس آدمی مل کر بھی اس پتھر کو اٹھا نہیں سکتے تھے۔ شیو بھگوان ہندوؤں کا ایک بہت بڑا دیوتا تھا جسے مہا دیو بھی کہا جاتا ہے۔ اس کا عضو تناسل بھی اس کی مورتی کے ساتھ پتھر پر نصب تھا۔

شیو لنگ کی پوجا کی جاتی تھی۔ مندر کے چاروں کونوں پر بھگوان شیو کی چاروں بیویوں کی مورتیاں رکھی تھیں، جن کے درمیان شیو بھگوان کا مجسمہ رکھا تھا۔ اس مجسمہ پر شیو لنگ بھی نصب تھا۔ شیو کی چاروں بیویوں کی مورتیاں اپنے سروں پر گنگا کے پانی سے بھرے ہوئے برتن (مٹکے) اٹھائے ہوئے تھیں۔ ان مٹکوں سے پانی آہستہ آہستہ فرش پر گر کر غائب ہو تا جاتا تھا۔ گنپت نام کا ہندو سنت اس شیو لنگ کا خیال رکھنے اور اس کی حفاظت پر مامور تھا۔ یہاں سال میں تین دن تہوار منایا جاتا تھا۔ ہندو مذہب کے ماننے والے لوگ شیو لنگ کے درشن اور پوجا کے لئے حاضری دیتے تھے۔ جن عورتوں کے اولاد نہیں ہوتی تھی وہ اکثر اتوار کو یہاں آکر اپنے مقصد حاصل کرنے کی خاطر شیو لنگ کی پوجا کرتی تھیں۔ غیر شادی شدہ عورتیں بھی شیو لنگ کی پوجا کرنے کے لیے ایک رات اس مندر میں گزارتی تھیں۔

منگلا ڈیم بننے اور تقسیم سے پہلے قلعہ تک رسائی موجودہ پاور ہاؤس کی طرف سے تھی۔ یہ منگلا قلعہ تک پیدل جانے کے لیے ایک قدیم راستہ تھا۔ اس راستے پر گاڑی کے لیے سڑک نہیں تھی، لوگ پیدل، گھوڑوں، اونٹوں اور خچروں پر سفر کرتے تھے۔ صاحب چک، تھپلہ، عزیز پور، لہڑی، چیچیاں اور گھٹیالی پتن سے ہو کر ہندو یاتری واپس ہندوستان

جاتے تھے۔ ۱۹۱۵ میں نہر اپر جہلم کی تعمیر کے بعد کچی سڑک منگلا، جاتلاں، سرائے عالمگیر اور گجرات کو ملاتی تھی۔

دوسرا راستہ قلعہ کے جنوب کی طرف تھا جس میں دریا گزرتا تھا۔ یہ راستہ شیخوپورہ اور دینہ کی طرف جاتا تھا۔ تیسرا راستہ منگلا قلعہ کے بالکل نیچے تھا جو دریا عبور کرنے کے بعد سلطان پور گاؤں کی طرف جاتا تھا۔ چوتھا راستہ قلعہ سے بیام اور پھر میرپور پہنچتا تھا۔ یہ تمام قدیم راستے تھے اور لوگ ان پر پیدل سفر کرتے تھے۔ منگلا دیوی کے تہوار کے موسم میں ہندو یاتری دور دراز کے مقامات سے قلعہ میں واقع درگاہ پر آتے تھے۔ یہ چاروں راستے منگلا قلعہ کے پہاڑ کے نیچے دھرم شالہ کے قریب ملتے تھے اور دھرم شالہ سے صرف ایک پہاڑی راستہ منگلا قلعہ کے اوپر جاتا تھا

پنجاب کی ریاست کانگڑہ کے ایک راجہ کے بیٹے کھڑک چند نے جب ۱۴۰۰ء میں ریاست کھڑی کھڑیالی کی داغ بیل ڈالی تو منگلا قلعہ کو اس کا صدر مقام بنا کر اپنی حکومت قائم کر لی۔ اس طرح چار سو سال تک یہ قلعہ کھڑی کھڑیالی ریاست کا صدر مقام رہا۔ انگریز مورخ آہچیسن اپنی کتاب "پنجاب کی پہاڑی ریاستوں کی تاریخ" میں لکھتے ہیں کہ کھڑی کھڑیالی ریاست کے بارے میں بہت کم معلومات ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ ۱۸۰۰ء کے بعد گجرات کے سکھ سردار صاحب سنگھ اور مہنت سنگھ شکر چکیا نے اس علاقہ پر حملہ کر کے اس قلعہ کو زیر کرنا چاہا لیکن ان کی قلعہ تک رسائی نہ ہو سکی اور وہ واپس چلے گئے۔

رنجیت سنگھ نے گجرات پر قبضہ کرنے کے بعد پہاڑوں کی طرف رخ کیا اور عمر خان سے چونین کا قلعہ فتح کر کے منگلا کی طرف رخ کیا۔ راجہ عمر خان نے اتنی بڑی طاقت

کے ساتھ جنگ کرنے کی بجائے اپنے بیٹے اکبر علی خان کے ذریعے مہاراجہ رنجیت سنگھ کے سامنے ہتھیار ڈال دیے۔ اسی دوران راجہ عمر خان کا انتقال ہو گیا تو رنجیت سنگھ نے آدھی ریاست اکبر علی خان کو دے دی۔ ۱۸۴۶ء میں جب کشمیر مہاراجہ گلاب سنگھ نے خرید لیا تو یہ قلعہ ڈوگرہ حکومت کی عملداری میں آ گیا اور ۱۹۴۷ تک یہ ڈوگرہ حکومت کے پاس رہا

منگلا قلعہ کی تعمیر بہت پرانی ہے۔ ابتداء میں یہ قلعہ بیس ایکڑ رقبہ پر محیط تھا۔ اب یہ قلعہ منگلا ڈیم کے جنوب مغربی کونے پر واقع ہے۔ سڑک سے قلعہ تک رسائی کے لئے اب دو راستے ہیں۔ ایک راستہ بنگ فوجی کالونی سے ہو کر گزرتا تھا جو پہلے شارع عام تھی۔ یہاں سے قلعہ تک سڑک جاتی ہے لیکن اب یہ شارع عام نہیں ہے۔ دوسرا راستہ لال بادشاہ کے مزار کے قریب سے ہو کر گزرتا ہے

منگلا ڈیم کی تعمیر کے دوران قلعہ کا ایک بڑا حصہ ڈیم کی نذر ہو گیا تھا۔ اب اس کا جنوب مغربی حصہ ہی باقی رہ گیا ہے جس کا رقبہ اندازہً پانچ چھ ایکڑ ہو گا۔ جیسے ہی آپ بڑے گیٹ سے قلعہ کے اندر داخل ہوں تو دائیں طرف جانے والی سڑک آپ کو قلعے کے مغرب میں واقع فصیل کی طرف لے جاتی ہے۔ اس فصیل کے سامنے چار پانچ گھاس کے قطعات ہیں جہاں پھولوں کی کیاریاں بنی ہوئی ہیں۔ فصیل کی دوسری سمت ساتھ نیچے گہری کھائی ہے۔ گیٹ سے اگر بائیں طرف والی سڑک سے اندر جائیں تو سامنے ایک محراب دار برآمدہ ہے جس پر ایک کمرہ واپڈا والوں نے تعمیر کیا ہے۔

منگلا ڈیم پر اپنے تحقیقی مضمون میں جنید بشیر نے لکھا ہے کہ منگلا قلعہ قدیم فنی تعمیر کا نمونہ ہے۔ مختلف ادوار کی سیاسی تبدیلیوں اور موسمی اثرات نے اس پر گہرے نقوش

چھوڑے ہیں۔ تعمیراتی انداز کی ساخت آٹھ رخی کثیر الاضلاع پر مبنی تھی جو پورے قلعے میں نظر آتی ہے۔ منگلا ڈیم کی تعمیر کی وجہ سے قلعے کا مشرق اور شمال کا نصف سے زیادہ رقبہ اور دیواریں ڈیم میں شامل ہو گیا تھا۔ قلعہ کے اندر مندر کا کوئی نام و نشان بھی نظر نہیں آتا۔

ابتداء میں یہ قلعہ مٹی اور پتھروں سے بنایا گیا تھا۔ بعد میں کی گئی تعمیر میں آرائشی محرابوں اور دوسرے آرائشی عناصر کا استعمال ڈوگرہ دور میں ملتا ہے۔ قلعہ کی تعمیر میں استعمال ہونے والے مواد میں ریتلا پتھر اور پتھر کے خاکہ کے علاوہ لکڑی کے بڑے بڑے شہتیر شامل تھے۔ بیرونی دیواروں میں پتھر اور خاکہ استعمال کیا گیا ہے۔ قلعہ کی کچھ دیواریں مختلف مقامات پر مختلف اونچائی پر مبنی تھیں جب کہ قلعہ کی دیواروں میں مختلف سائز کے گھڑے ہوئے پتھر استعمال ہوئے جن کی لمبائی ڈیڑھ سے تین فٹ کے درمیان ہے اور بعض جگہ چونے کے پتھر کا استعمال بھی نظر آتا ہے۔

قلعے میں پرانی کوئی بھی چھت سلامت نہیں ہے جس سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکے کہ قلعے کی چھتیں کیسی تھیں۔ قلعہ کے اندر اب موجود کوئی بھی کمرہ اپنی اصل حالت میں نہیں ہے واپڈا نے ڈیم کی تعمیر کے دوران ان کو تبدیل کر دیا ہے۔ مشرق اور جنوب میں قلعہ کی دیواریں اونچی تھیں جبکہ شمال اور مغرب کی سمت میں زیادہ بلند نہیں تھیں جونکہ یہاں ساتھ گہری کھائیاں تھیں۔ دیواروں میں بڑے اور لمبوترے سوراخ رکھے گئے ہیں۔ یہ سوراخ (جھانکنے والی کھڑکیاں) قلعے سے نیچے گہرائی میں دشمنوں کی کارروائیوں پر نظر رکھنے اور بوقت ضرورت ان پر آگ برسانے یا گرم پانی ڈالنے کے لیے استعمال ہوتی

تھیں۔ باوجود کوشش کے اس قلعے کے بارے میں کوئی تحریری مواد کسی لائبریری سے نہیں ملا۔

کبھی یہ قلعہ اپنی شان و شوکت سے مقامی لوگوں اور سیاحوں کو متاثر کرتا تھا۔ وہ انھیں اپنے ہاں پکنک اور سیر و تفریح کا ایک خوشگوار ماحول فراہم کرتا تھا۔ کیونکہ آس پاس کے علاقہ میں یہ واحد جگہ تھی جہاں انسان زندگی کی یکسانیت سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لئے اپنا کچھ وقت گزارتے تھے، ان سے اب یہ سہولت واپس لے لی گئی ہے۔ پچھلے بیس سال سے یہ قلعہ بند پڑا ہے۔ یہ کتنی ستم ظریفی کی بات ہے کہ جس علاقہ کے عوام نے اپنے اباؤ اجداد کی قبریں تک ڈیم کے پانی میں ڈبو دی ہیں انھیں اس تفریح مقام تک جانے کے لیے منع کر دیا گیا ہے۔ میری آزاد کشمیر گورنمنٹ اور محکمہ سیاحت سے گزارش ہے کہ قلعہ کو عوام کے لیے جلد از جلد کھولا جائے۔ محکمہ آرکیالوجی اس قلعہ کی تاریخ اور اس کے مختلف ادوار پر تحقیق کرا کے ایک اچھا سا پمفلٹ شائع کروا کر اسے سیاحوں کے لیے رکھے۔

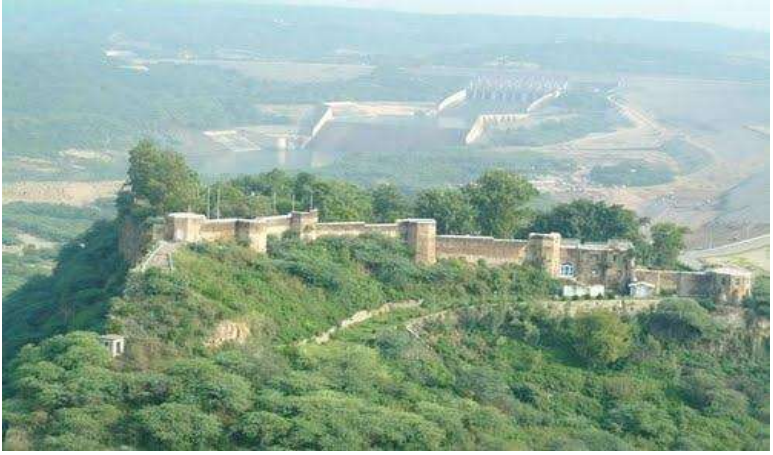

قلعہ اکراند:

اکراند قلعہ وادی سون سکیسر میں راجہ تاتار خان جنجوعہ نے تعمیر کروایا تھا۔ اس قلعہ کی تعمیر کا مقصد علاقائی حملوں سے خود کو محفوظ رکھنا تھا۔ یہ قلعہ اطراف سے بڑے پتھروں اور گھنے جنگل سے گھرا ہوا تھا۔ یہاں پر صرف ایک ہی راستہ ہے جو کہ قلعہ تک رسائی دیتا ہے جس کا راستہ کنہٹی باغ کی طرف سے جاتا ہے۔ اس قلعہ کے اندر گھوڑوں کے اصطبل، رہائشی عمارتیں اور اسلحہ زخیرہ کرنے کی سہولت کے تحت عمارات تعمیر کروائی گئی تھی۔ جو کہ اب کھنڈرات میں تبدیل ہو چکا ہے۔ اس قلعہ کے راستہ میں ایک قبر بھی موجود ہے جس کو راجہ تاتار کی قبر کے طور پر منسوب کیا جاتا ہے۔ یہ قلعہ ماہرین آثار قدیمہ کی طرف سے بہت قیمتی اور معلومات سے بھرا ہوا ہے۔ اور اپنے اندر بے بہا حیرت انگیز منظر نامہ رکھتا ہے۔ اس قلعہ تک پہنچنے کا راستہ بہت مشکل اور صبر آزما ہے۔ مصنف

تاریخ جنجوعہ راجہ انور خان جنجوعہ کا تعلق راجہ تاتار خان جنجوعہ کی اولاد سے ہے اورآپکی پیدائش بھی راجہ تاتار کے آبائی گاوں کھوتکہ موجودہ احمد آباد میں ہوئی۔

قلعہ تک پہنچنے کا راستہ کلر کہار سے تقریباً ۶۵ کلو میٹر اور خوشاب سے ۹۵ کلو میٹر بنتا ہے۔ وادی سون سکیسر میں احمد آباد اور کھبیکی گاوں کے بعد راستہ کنہٹی باغ کی طرف جاتا ہے جہاں سے قلعہ تک پہنچنے کیلیے پیدل سفر کرنا ہوتا ہے۔ جنجوعہ تاریخ میں دلچسپی رکھنے والے افراد کیلیے یہ قلعہ ایک بہت معلوماتی سفر کا تاثر رکھتا ہے اور اس کے ارد گرد کے علاقوں پر اپنے گذرے ہوئے وقت پر ایک نظر ڈالنے سے جنجوعہ قوم کا عروج اور اسکا زوال سمجھنے میں بہت مدد ملتی ہے۔ وادی سون کے دیگر قدیم قلعوں کے برعکس قلعہ اکراند نسبتاً پسماندہ قلعہ سمجھا جا سکتا ہے کسی زمانے میں تعمیر کیے گئے مکانات کے لئے جو پتھر استعمال کیا گیا اس کو زیادہ گھڑا نہیں گیا۔ نہ ہی یہ پتھر کسی ترتیب کے مطابق ایک دوسرے کے اوپر رکھے گئے۔ پھر بھی یہ قلعہ گذرے وقتوں کی عمدہ داستان بیان کرتا ہے

قلعہ تلاجہ:

مقامی روایات کے مطابق اس قلعہ کی تعمیر پانچ ہزار سال قبل ہوئی تھی، تاریخی طور پر اپنی طرز کے اس قلعے کو جلال الدین خوارزمی کے ساتھ بھی منسلک کیا جاتا ہے جس نے چنگیز خان سے بچنے کیلیے اس وادی میں پناہ لی، قلعے پر موجود آبادی کے آثار اس روایت کی حمایت نہیں کرتے

ماہرین آثار قدیمہ کی ابتدائی تحقیق کے مطابق یہ بات سامنے آئی ہے کہ اس قلعے کی تعمیر کو کسی بھی صورت پانچ ہزار سال قبل سے نہیں جوڑا جاسکتا مکانوں کے طرز تعمیر، استعمال ہونے والے پتھروں کا سائز، آبادی کی مختلف حصوں کی تقسیم اور سطح پر بکھرے انسانی استعمال میں رہنے والی چیزیں اس بات کی عکاسی کرتی ہیں کہ یہاں مسلمان آباد تھے جو جلال الدین خوارزمی کے آنے سے پہلے اس جگہ کو اپنے مسکن کے طور پر استعمال کر رہے تھے۔

ضلع خوشاب کے خوبصورت علاقے وادی سون کی تلاجہ نامی جگہ کو دیکھ کر اب یہاں انسانی آبادی کا وہم و گمان تک نہیں ہوتا لیکن تاریخ دانوں کے مطابق یہ ایک شہر تھا جو پانچ ہزار سال قبل یہاں آباد تھا۔

اس کا محل وقوع پاکستان سالٹ رینج جو قلعہ ٹلہ جوگیاں (کوہستان نمک) سے کمان کی صورت میں کالاباغ تک پھیلا ہوا ہے۔ خوشاب شہر سے نوشہرہ کی طرف سفر کرتے ہوئے تقریباً ۲۰ کلو میٹر فاصلے پر دربار بابا کچھی کا سڑک پر بورڈ آویزاں ہے جہاں سے دربار تک کا راستہ موٹر سائیکل یا ہلکی گاڑی پر کیا جاسکتا ہے

دربار سے ایک چھر کا (راستہ) کی شکل میں تلاجہ تک پیدل سفر کرنا پڑتا ہے جو انتہائی دشوار گزار، ٹیڑھے میڑھے راستے کی شکل میں ہے۔

قلعہ ایک بلند چٹان نما شدید عمودی پہاڑی پر واقع ہے۔ قلعہ تلاجہ جلال الدین خوارزم نے تاتاریوں کے خلاف لڑائی کے بعد تعمیر کیا۔ تلاجہ میں واحد داخلی عمودی راستہ سرنگ نما ہے جسے ایک بڑی چٹان سے بند کیا جاتا رہا۔ اس کے علاوہ اندر جانے کا کوئی اور راستہ نہیں یا پھر فضائی طریقہ کار (ہیلی کاپٹر وغیرہ) استعمال ہو سکتا ہے، فی وقت اس داخلی راستے پر قوی ہیکل دروازے کا کردار ادا کرنے والی چٹان کے سوا سب کچھ قریب ویسے کا ویسا ہی موجود ہے۔ بعض مقامات پر تہہ در تہہ پتھروں سے انداز لگایا گیا ہے کہ یہ شہر زلزلوں کی وجہ سے شکست و ریخت ہو گیا۔ تلاجہ میں جگہ جگہ دائرے اور ان کے ارد گرد فوسلز بھی ملتے ہیں جن سے بڑے جانوروں کا تصور ذہن میں ابھرتا ہے، یہاں چھوٹے بڑے چند کمرے موجود ہیں جو لائم سٹون سے بنائے گئے ہیں جن میں سے اکثر ٹوٹ پھوٹ کے عمل سے گزر رہے ہیں۔

قلعہ کے وسط میں ایک بڑے تالاب کے آثار نمایاں ہیں جن کے کنارے پکی اینٹوں سے بنائے گئے ہیں۔

تلاجہ میں قبریں بڑے سائز کی ہیں جن کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ یہاں بسنے والے لوگ اچھے قد کاٹھ کے مالک ہوں گے۔ چند جگہ کھدائی دیکھنے کو ملی جس سے ایک خیال ابھرتا ہے کہ کچھ لوگ یہاں خزانے کی تلاش میں قبروں وغیرہ کی کھدائی کرتے رہے ہیں۔

لائم سٹون کا تصور بھی ابھرتا ہے کیونکہ تالاب کے کنارے لگی اینٹوں کو چونے وغیرہ سے جوڑا جاتا رہا یعنی اسے سیمنٹ کے طور پر استعمال کیا گیا ہے۔

تلاجہ کے قریبی علاقے امب شریف میں سٹوپا اور دیگر پائے جانے والے آثار کا بھی اس سے تعلق ہو سکتا ہے۔

تلاجی دیوی اور اس کے بھائی تلاجہ کے مندر بھارت کے شہر مہاراشٹر میں ہیں، تلاجہ کا علاقہ بھارت کے صوبے مہاراشٹر میں بھی پایا جاتا ہے یہاں تلاجی دیوی اور اس کے بھائی تلاجہ کے مندر یا آشرم موجود ہیں۔ امکان ہے کہ وادی سون میں موجود تلاجہ شہر کا اس سے قدیمی تعلق واسطہ ہے۔

یہاں یہ امر قابل ذکر ہے کہ خوشاب کی تاریخ لکھنے والے اور آثار قدیمہ سے دلچسپی رکھنے والوں نے وادی سون میں تلاجہ کے علاوہ بھی کئی جگہوں کی نشاندہی کی ہے جہاں پرانے آثار، فوسلز اور ہڈیوں کے علاوہ کئی اور چیزیں ملی ہیں، تلاجہ کی ساخت اس کی اصل جیسی تو نہیں بہر کیف اپنی انفرادیت کو تاحال اپنے زبوں حال قلعے میں سمیٹے بیٹھی

ہے۔

سندھ کے قلعے:

کوٹ ڈیجی قلعہ:

ضلع خیر پور کے قصبے کوٹ ڈیجی میں واقع قلعہ ۱۸ ویں صدی کے تالپور دور کا ہے۔ یہ صحرائے تھر کے کنارے دریائے سندھ سے تقریباً ۲۵ میل مشرق میں واقع ہے۔ یہ قلعہ ہڑپہ تہذیب سے پہلے کے آثار قدیمہ کے مقام ڈیجی پہاڑی پر (جس کی تاریخ ۲۵۰۰ سے ۲۸۰۰ قبل مسیح ہے) تعمیر کیا گیا۔

’کوٹ ڈیجی کا یہ وہ مقام ہے جہاں سے وادی سندھ کی تہذیب نے جڑیں پکڑیں۔ محقق ’مانک پتھاوالا‘ کے مطابق ’اس ٹیلے میں دفن تہذیب کی نشاندہی ۱۹۳۵ء میں بمبئی یونیورسٹی کے اسکالر مادھو سروپ نے کی جس کا تجزیہ تھا کہ یہ تہذیب تاریخ سے پہلے والے زمانے کی ہے‘۔

تقریباً ۲۰ برس کے بعد ۱۹۵۵ء اور ۱۹۵۷ء میں اس سائٹ کی پاکستان آرکیالوجی ڈپارٹمنٹ نے کھدائی کروائی۔ اس کھدائی کی رپورٹ میں ڈاکٹر افضل احمد خان نے انکشاف کیا کہ ’کوٹ ڈیجی کی تہذیب موئن جو دڑو والی تہذیب سے ۷۰۰ برس قدیم ہے، اور ان آثاروں کی لمبائی مشرق سے مغرب کی طرف ۶۰۰ فُٹ اور چوڑائی یعنی شمال سے جنوب کی طرف ۴۰۰ فُٹ جب کے اونچائی ۴۰ فُٹ ہے‘۔

آرکیالوجی رپورٹ کے مطابق ’اس مدفون شہر کے دو حصے ہیں جن میں سے ایک حصہ قلعے کے اندر ہے جس میں حکمران طبقات رہتے ہوں گے اور دوسرا حصہ قلعے کے باہر ہے جس میں دستکار لوگ رہتے ہوں گے جو ان دنوں غلاموں کی حیثیت رکھتے تھے۔ یہ لوگ اجتماعی طور پر ایک سماجی طبقے کی کمین کا درجہ رکھتے تھے اور حکمران طبقہ اجتماعی طور پر ان پر مالکانہ حقوق رکھتا تھا۔

تاریخی قلعہ کوٹ ڈیجی، ریاست خیرپور کے شاہی خاندان کے شاہانہ انداز کی گواہی دیتا ہے۔ خیرپور ریاست کے پہلے حکمران میر سہراب خان تالپور نے تین قلعے تعمیر کروائے تھے، جن میں سے ایک قلعہ احمد آباد تھا۔ چونکہ یہ قلعہ ڈیجی پہاڑی کی اسی پرانی بستی پر بنایا گیا تھا اس لیے یہ ’کوٹ ڈیجی‘ کے نام سے پکارا جاتا ہے۔

اس کے علاوہ باقی دو قلعے سرحد کے اس پار بھارتی شہروں جودھ پور اور جیسلمیر میں راجستھان کے صحرا میں آج بھی موجود ہیں۔ کوٹ ڈیجی قلعہ کی تعمیر کا آغاز ۱۷۸۵ء میں کیا گیا جبکہ اس کی تکمیل ۱۷۹۵ء میں ہوئی۔ قلعے کو ایرانی ماہر تعمیرات نے ڈیزائن کیا جبکہ تعمیراتی کام کی نگرانی خیرپور ریاست کے وزیر تعمیرات سرائی محمد صالح زہری بلوچ نے

کی تھی۔ اس کی تعمیر میں ہزاروں مزدوروں، کاریگروں اور ماہرین نے حصہ لیا۔ ایک اندازے کے مطابق یہ قلعہ سطح زمین سے ۷۰ فٹ کی بلندی پر ہے جبکہ اس کی لمبائی ۵ ہزار فٹ اور چوڑائی ۳ ہزار فٹ ہے۔ اس کا طول و عرض ۸۵ ہزار ۷۳۰ مربع میٹر ہے۔ قلعے کی فصیل پکی اینٹوں سے تعمیر کردہ ہے اور چاروں طرف فصیل اور پہاڑوں پر مورچے بنائے گئے تھے۔ تقریباً ایک اعشاریہ آٹھ مربع کلومیٹر پر بنے اس تاریخی قلعے میں کئی چھوٹے بڑے بُرج بنائے گئے ہیں۔ ان میں قلعے کے مشرقی سمت ۵۰ فٹ اونچا فتح برج (سفید ٹھل) ہے، جسے وکٹری ٹاور بھی کہا جاتا ہے۔ یہاں تالپور حکمرانوں کا سرکاری جھنڈا لگایا جاتا تھا اور اس میں سپہ سالار کی رہائش گاہ بھی تھی۔ اس کے علاوہ ایک برج، مریم ٹھل پر تگالی مریم توپ رکھی ہوتی تھی۔ قلعے کے مشرقی حصے کی طرف جانے کے لیے جو برج استعمال ہوتا تھا اس کا رُخ بھارتی صحرائی ریاست راجستھان کے جیسلمیر کی طرف رکھا گیا ہے، اسی وجہ سے اسے جیسلمیر ٹھل برج پکارا جاتا ہے۔

قلعے میں اندر داخل ہونے کے لیے مضبوط لکڑی کا ایک ہی بڑا دروازہ بنایا گیا ہے۔ دیواروں پر جانے کے لیے اندر بنی سیڑھیاں اور مورچے دیکھنے سے تعلق رکھتے ہیں۔ قلعے میں شمالی طرف اوپر کے حصے میں ایک اونچے اور پختہ چبوترے پر والئ ریاست کے لیے سفید پتھروں سے ایک بارہ دری بنائی گئی ہے، جہاں میر سہراب خان کا دربار لگا کرتا تھا۔ پتھر کی یہ تخت گاہ فنِ سنگ تراشی کا خوبصورت اور بیش قیمت نمونہ ہے۔ قلعے کے رہائشی حصے تک پہنچنے کے لیے تین بڑے لکڑی کے انتہائی مضبوط دروازوں کو عبور کرنا پڑتا ہے۔

ہاتھیوں کے حملے سے بچنے کے لیے دروازوں پر آہنی نوک دار کیلیں ٹھونکی گئی ہیں۔ یہ کیلیں اس طرح ابھری ہوئی ہیں کہ ایک بار ان سے ٹکرانے کے بعد کوئی بھی جاندار شدید زخمی ہو جائے گا۔ پہلے دروازے کو عبور کریں تو سامنے چھوٹے میدان میں پہنچتے ہی بائیں جانب کنواں نظر آئے گا۔ سامنے ہی ایک کمرہ دکھائی دیتا ہے، جو شاید گودام کے طور پر استعمال کیا جاتا تھا۔ اس کمرے کی چھت موجود نہیں ہے جبکہ اس کے سامنے والی دیوار میں چراغ رکھنے کے لیے سینکڑوں سوراخ موجود ہیں۔

گودام کے بائیں جانب ایک حوض نظر آتا ہے، جس کی لمبائی ۳۷فٹ، چوڑائی ۳۳فٹ اور گہرائی ۱۲فٹ ہے۔ یہ حوض قلعے میں پانی کی ضروریات پورا کرنے کے لیے بنایا گیا تھا۔ قلعے کے مرکزی دروازے سے کچھ دوری پر شمالی جانب سابق والئی ریاست کی عارضی رہائش گاہ موجود ہے۔ اس کی بیرونی چار دیواری اور باورچی خانے کو کچی اینٹوں سے بنایا گیا ہے جبکہ اندر رہائشی حصے کو پختہ اینٹوں، مغلیہ طرز کے محرابی دروازوں اور خوبصورت نقش و نگار سے سجایا گیا ہے۔

کوٹ ڈیجی قلعہ دفاعی اور انتظامی مقاصد کے لیے مخصوص کیا گیا تھا۔ یہاں تقریباً ۱۸۴۳ء تک ایک سالار کی نگرانی میں ۵۰۰ سپاہیوں کا دستہ ۱۰۰ توپوں کے ساتھ تعینات کیا جاتا رہا۔ یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ قلعے کے اندر یا باہر کبھی کوئی جنگ نہیں لڑی گئی مگر اس میں بڑی بڑی توپیں موجود تھیں، جن میں سے تین توپیں خاص طور پر مشہور ہوئیں۔ ان میں ایک ’مریم توپ‘ ہے، جسے پرتگال کا شاہ اپنے ساتھ لایا تھا لیکن روہڑی کے قریب دریائے سندھ پر اسے چھوڑ کر چلا گیا تھا۔ وہاں سے میر سہراب خان نے

اس توپ کو ہاتھیوں کے ذریعے کوٹ ڈیجی پہنچایا۔ کہا جاتا ہے کہ مریم توپ میں دو ایسے کڑے لگے ہیں جو ہر سال اپنی جگہ بدلتے رہتے ہیں یعنی اگر ایک سال وہ اوپر کے حصے میں ہوں تو اگلے سال نچلے حصے میں نظر آئیں گے۔ باقی دو توپیں ‘صنعا صنعا’ اور ‘ملک میدان’ کے نام سے مشہور ہوئیں۔ خیر پور کے میروں نے جب قلعہ کوٹ ڈیجی کو اپنا دارالخلافہ بنایا تو یہاں امیروں اور وزیروں کے محلات اور مکانات کی تعمیر شروع ہوئی جبکہ ارد گرد رہائش پذیر لوگ بھی سرکاری کاموں کے لیے یہاں آنے لگے۔ ۱۸۴۵ء تک کوٹ ڈیجی کو بڑی اہمیت حاصل تھی مگر انگریزوں کی حکومت قائم ہونے کے بعد جب سر چارلس نیپئر اس علاقے کے ریذیڈنٹ تعینات ہوئے تو کوٹ ڈیجی کی جگہ خیر پور نے لے لی۔

رنی کوٹ قلعہ:

رنی کوٹ قلعہ کو کچھ لوگ اردو میں رانی کوٹ لکھتے ہیں جو درست نہیں۔ اس قلعہ کا نام کسی رانی کے حوالے سے نہیں پر قلعہ میں سے بہتی ہوئی برساتی ندی کی وجہ سے پڑا ہے۔ عظیم دیوار سندھ رنی کوٹ قلعہ سندھ کے موجودہ ضلع جامشورو کے شہر سن کے مغرب میں ۳۵ کلومیٹر کے فاصلے پر کیرتھر سلسلے کی لکی پہاڑیوں پر موجود ہے۔ اس قلعہ کا احاطہ یا لمبائی ۳۲ کلومیٹر ہے۔ رنی کوٹ کے چار دروازے ہیں۔ مغرب میں موہن گیٹ، شمال میں آمری گیٹ جو پہلے بودھی (بدھ مت کی) پل کے نام سے تاریخ میں درج ہے مگر بعد میں آمری گیٹ سے مشہور ہوا، تیسرا جنوب میں شاہ پر یا شاہ پیر گیٹ جو ایران کے شہر شاپور کی نشاندہی ہے۔ چوتھا سن گیٹ جو بعد کا نام لگتا ہے۔

رنی کوٹ کے نام پر غور کرتے ہیں تو یہ نام قلعہ کے درمیان میں سے بہتی برساتی ندی کی وجہ سے پڑا۔ برساتی ندی کو سندھی زبان میں ‘نئں یا نئے’ کہتے ہیں۔ رنی کوٹ میں سے بہتی ندی کو اب ‘رنی’ کہتے ہیں مگر اس کا قدیم نام ‘نئں یا نئے رون’ تھا جس کا ذکر کتاب چچ نامہ میں ہے۔ رون کا سندھی زبان میں مطلب ہے، پانی جب کسی بند یا دیگر جگہ سے چھپے انداز میں اندرونی طور سوراخ کر کے باہر بہنے لگے۔ جیسے دریا کے بند کو اندر سے چھپے انداز میں سوراخ ہوتا ہے اور بڑھتا ہے تو شگاف کی صورت اختیار کرتا ہے۔ اس طرح برساتی ندی یا نئں موہن گیٹ سے رون (سوراخ) کی طرح بہتی سن گیٹ سے باہر نکلتی ہے۔ اس ندی میں قدرتی چشموں کا پانی مستقل بہتا رہتا ہے۔ مقامی لوگ رنی کوٹ کے اندر چھوٹی سی

وادیوں کی زمین سیراب کرتے اور فصل اگاتے ہیں۔ رنی کوٹ میں اس پانی سے وادیاں سرسبز اور سحر انگیز نظر آتی ہیں۔

اس نئی یا برساتی ندی کو پہلے نئی رون بعد میں نئی رون سی نئی رونی، نئی رونی سے نئی رینی اور پھر رنی کہا گیا۔ اس نئی سے گھرا ہوا کوٹ یا قلعہ رنی کوٹ ہے۔ محمد بن قاسم کی مہم کے دوران عربوں نے اسے نیرون (نئی رون) کوٹ کہا اور بعد میں اسے رونی کوٹ۔ بعد میں رنی کوٹ کہا گیا اور اب تک رنی کوٹ سے ہی مشہور ہے۔

رنی کوٹ قلعہ کے احاطے میں تین چھوٹے قلعے ہیں۔ میری کوٹ، شیر گڑھ اور موہن کوٹ۔ میری کوٹ رنی کوٹ قلعہ کے مرکز میں اونچی پہاڑی پر ہے۔ شیر گڑھ میری کوٹ کے شمال میں بلند چٹان پر ہے جب کہ موہن کوٹ مغرب میں موہن گیٹ کے قریب جنوبی بلند پہاڑی پر ہے۔ میری کوٹ دفاعی قلعہ کے ساتھ ساتھ شاہی رہائشی قلعہ بھی ہے۔ شیر گڑھ قلعہ ایسی جگہ پر ہے جو سر کرنا بہت مشکل ہے۔ میرے خیال کے مطابق یہ وہ قلعہ تھا جسے سر کرنے یا فتح کرنے سے پورا رنی کوٹ قلعہ فتح ہو جاتا ہو گا۔ اس وقت شیر گڑھ کا راستہ کچھ بہتر کیا گیا ہے اور سیاح تھوڑی تکلیف کے بعد سر کر سکتا ہے۔ شیر گڑھ قلعہ کی تعمیر میری کوٹ سے ملتی جلتی ہے۔ جب کہ موہن قلعہ کی تعمیر کچھ قدر سادہ ہے۔ رنی کوٹ کی طرح میری کوٹ، شیر گڑھ قلعہ اور موہن قلعہ پر بھی چلنے کے لئے فوٹ پیریاں اور دفاعی مورچے ہیں۔

رنی کوٹ قلعہ کی تاریخ کو جان بوجھ کر متضاد بنایا گیا ہے۔ پہلی متضاد رائے سندھ کے محقق ڈاکٹر نبی بخش بلوچ (لغاری) نے ایک شاعر کے ذکر سے دی ہے اور لکھا ہے کہ

سندھ میں تالپور حکمرانوں کے حکم پر نواب ولی محمد لغاری نے رنی کوٹ تعمیر کروایا تھا۔ بلوچ کی رائے کسی تاریخی ماخذ کے حوالے کے بغیر صحتمند نہیں لگتی۔ تاہم اکثر محققوں نے بلوچ کی تقلید کی۔ یہ ممکن ہو سکتا ہے کہ تالپور حکمرانوں نے قلعہ کے کچھ حصوں کی مرمت کروائی ہو۔ سندھ کی تاریخ میں حوالہ جات موجود ہیں کہ تالپوروں سے پہلے کلھوڑا حکمرانوں نے رنی کوٹ کو دارالحکومت بنانے کا فیصلہ کیا تھا جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ رنی کوٹ تالپوروں سے پہلے موجود تھا۔

معروف آرکیالوجسٹ پائلو بائیجی اور ان کے ساتھیوں نے رنی کوٹ قلعے کی کاربن ڈیٹنگ کی تھی مگر اس کا سیمپل سن گیٹ سے باہر بعد کے تعمیر کیے گئے پلر سے لئے تھے۔ کاربن ڈیٹنگ کے بعد ثابت کرنے کی کوشش کی کہ رنی کوٹ قلعہ ۱۸۱۲ء میں تعمیر ہوا تھا۔ اکثر محققین نے پائلو بائجی کی کاربن ڈیٹنگ کو رد کیا ہے اور کہا ہے کہ کاربن ڈیٹنگ کے لئے سیمپل رنی کوٹ کی کسی پرانی دیوار سے لئے جاتے تو یقین کیا جا سکتا تھا۔

سندھ کے مشہور مورخ ایم ایچ پنہور نے لکھا ہے کہ ۱۵۲۶ء میں مغل بابر نے ہندستان پر حملے کے وقت رنی کوٹ میں قیام کیا تھا۔

بلاشبہ رنی کوٹ بہت قدیم ہے۔ میری کوٹ کے دروازے پر سورج مکھی پھول نقش ہے جو ایران کے علاوہ ہندو اور دوسرے مذاہب میں متبرک ہے۔ کنول کے پھولوں کی نقش نگاری بدھ مت کو ظاہر کرتی ہے۔ مور پرندے کی نقش نگاری جو مختلف غیر مسلم مذاہب کی مذہبی علامت ہے، رنی کوٹ قلعہ کے اندر اور باہر شاہ پر گیٹ کے قریب

زر تشتی آثار ہیں جو سندھ پر ایرانی غلبے کی نشاندہی کرتے ہیں اور قلعہ کی قدامت پر روشنی ڈالتے ہیں۔

رنی کوٹ کی تعمیر اور ایران کے ساسانی دور کے گورگان اور فلک الفلک قلعوں میں مماثلت بھی اس قلعہ کی قدامت کی شاہد ہے۔ سن گیٹ کے قریب گنبد والی تعمیر کو بدھ مت کی یادگار مانا جاتا ہے کیوں کہ یہ مسجد ہوتی تو اس کا محراب ہوتا۔ اگر اس میں قبر ہوتی تو مقبرہ مانا جاتا۔ اس کے علاوہ بدھ مت کے دوسرے آثار اور باقیات سے ظاہر ہوتا ہے کہ قلعہ تالپور اور کلہوڑا دور سے قدیم ہے۔ بڑی بات کہ رنی کوٹ کے موہن گیٹ اور موہن قلعہ کا نام غیر اسلامی ہے جو قلعے کی تالپور دور سے پہلے ہونے کی تصدیق کرتا ہے۔ کیوں کہ مسلمان موہن نام نہیں رکھ سکتا۔ جید مورخین کی رائے ہے کہ رنی کوٹ سندھ پر ساسانی حکمرانی کے دور میں تعمیر ہوا تھا۔

رنی کوٹ میں ٹیلوں کے پتھروں پر قدیم تحریریں بھی نقش ہیں۔ یہ تحریریں کسی مقامی قدیم رسم الخط میں نقش کی گئی ہیں۔ تحریریں قدیم براہمی رسم الخط یا کسی اور علیحدہ رسم الخط میں نقش کی گئی ہیں۔ ٹیلوں پر نقش کی گئی یہ تحریریں بھی رنی کوٹ کی قدامت پر روشنی ڈالتی ہیں اور ثابت کرتی ہیں کہ رنی کوٹ تالپور دور سے پہلے قائم تھا اور لوگ پہلے مقیم تھے۔

کچھ مورخوں اور محققوں کی رائے ہے کہ یہ قلعہ سندھ میں راء خاندان کے دور میں تعمیر ہوا۔ راء خاندان اور برہمن خاندان کے دور میں نیرون کوٹ کے نام سے موجود تھا۔ چچ نامہ کے مطابق یہ قلعہ برہمن خاندان کے دور میں نیرون کوٹ کے نام سے صفحہ

ہستی پر تھا۔ سندھ کی تاریخ پر پہلی کتاب چچ نامہ سے ظاہر ہوتا ہے کی محمد بن قاسم دیبل فتح کرنے کے بعد ساکرو (موجودہ ضلع ٹھٹھا) سے نیرون کوٹ کی طرف بڑھا تھا اور نیرون کوٹ کی فتح کے بعد میں سیوستان (سیہون) کی طرف بڑھا تھا۔ چچ نامہ میں نیرون کوٹ کا دیبل سے فاصلہ، نیرون کوٹ کا راستہ، محل وقوع اور کوٹ کے جو دروازے بیان کیے گئے ہیں وہ رنی کوٹ کو ظاہر کرتے ہیں۔ رنی کوٹ قلعہ ہی قدیم نیرون کوٹ قلعہ ہے جو سندھ پر ساسانی دور حکومت کی یادگار ہے۔

قلعہ نوکوٹ:

سندھ دھرتی کی تاریخ بہت پرانی ہے۔ روایت کے مطابق سکندر اعظم بھی یہاں آیا اور کچھ دن قیام پذیر رہا۔ یہاں قدیم ترین تہذیب و ثقافت کے آثار پائے جاتے ہیں۔ صوبہ سندھ میں موہن جو دڑو جیسے بین الاقوامی اہمیت کے حامل شہر کے کھنڈرات موجود ہیں جبکہ تاریخی اہمیت کے حامل کئی قلعے بھی موجود ہیں جنھیں سندھی زبان میں 'کوٹ' کہا جاتا ہے۔

ان میں سے ایک قلعہ سندھ کے دورافتادہ مقام تھرپارکر کے ایک چھوٹے اور پس ماندہ شہر نوکوٹ میں واقع ہے۔ اسے ”تھر کا دروازہ“ بھی کہا جاتا ہے کیونکہ یہ صحرائے تھر کے داخلی راستے پر تعمیر شدہ ہے۔ یہ میدانی اور ریگستانی علاقوں کے سنگم پر واقع ہے، جہاں حدنگاہ تک ریت ہی ریت دکھائی دیتی ہے۔ میرپورخاص سے تقریباً ۷۵ کلومیٹر کے فاصلے پر نوکوٹ شہر میں واقع یہ قلعہ تھرپارکر کی تہذیب وتمدن کا عکاس ہے۔

سن ۱۷۸۳ میں میر فتح علی خان تالپور نے ہلانی کی لڑائی میں کلہوڑوں کو شکست دینے کے بعد اپنی حکمرانی قائم کی اور خود کو سندھ کا پہلا رئیس یا حکمران قرار دیا۔ اپنی حکومت کو مضبوط بنانے کے لیے اس نے اپنے بھائیوں میر غلام، میر کرم اور میر مراد کو حکومت میں شامل کرلیا اور حیدرآباد کو اپنا دارالحکومت قرار دیا، جبکہ میر فتح علی خان تالپور کے بھتیجے نے خیرپور میں خاندان کی ایک شاخ قائم کی۔ ایک اور رشتہ دار، میر تھرا خان نے جنوب مشرقی سندھ میں میرپورخاص کے آس پاس کے علاقے میں منکانی شاخ قائم کی (میرپورخاص شہر کی بنیاد ان کے بیٹے میر علی مراد تالپور نے رکھی تھی)۔

اس دور میں عمرکوٹ پر جودھپور کا مہاراجہ قابض تھا جبکہ جنوب میں تھر والی اراضی پر تھر کے سرکش اور باغی ”سوڈھے (ٹھاکر) سرداروں“ کا قبضہ تھا۔ کلہوڑہ دور میں وہ محصولات (خراج) کی ادائیگی کرتے تھے لیکن تالپور خاندان کی حکومت قائم ہونے کے بعد سوڈھوں نے محصولات دینے سے انکار کردیا، جس کے بعد میر فتح علی خان تالپور نے یہ فیصلہ کیا کہ سوڈھوں سے محصولات کی وصولی کے لیے سخت رویہ اختیار کیا جائے گا۔

اس مقصد کے لیے تھر میں مختلف مقامات پر قلعے تعمیر کروائے گئے جہاں حکومتی کارندوں کو بذریعہ قوت سوڈھوں سے محصولات وصول کرنے کی ذمہ داری سونپی گئی۔ ۱۸۱۲ء میں میر کرم علی خان تخت پر بیٹھا اور اس نے ۱۸۱۳ء میں جودھپور کے مہاراجہ سے عمرکوٹ حاصل کیا اور تھر میں کچھ قلعے بھی تعمیر کروائے۔

تھر میں تعمیر کردہ نوکوٹ قلعہ کے حوالے سے متضاد آراء پائی جاتی ہیں۔ ایک کے مطابق اس کی تعمیر میر علی مراد خان تالپور نے ۱۷۸۹ء میں کروائی۔ اس کی تعمیر کا بنیادی مقصد سوڈھوں اور انگریزوں کے مقابلے میں دفاع اور انھیں زیر کرنا تھا۔ یہ کہا جاتا ہے کہ بعدازاں ۱۸۱۴ء میں میر کرم علی خان تالپور نے قلعے کو تباہی سے بچانے کے لیے حفاظتی اقدامات کیے اور اس کی مرمت کروائی۔ دوسری رائے کے مطابق ۱۸۱۴ء میں میر کرم علی خان تالپور نے دفاعی و رہائشی مقاصد کے تحت نوکوٹ قلعہ کی تعمیر کروائی تھی۔ ایک اندازے کے مطابق اس کی تعمیری لاگت تقریباً ۸ لاکھ روپے سے زائد تھی۔

قلعے کی لمبائی تقریباً ۶۴۰ فٹ اور چوڑائی ۴۴۰ فٹ ہے۔ قلعہ کی تعمیر پکی اینٹوں سے کی گئی ہے جبکہ انھیں جوڑنے کے لیے مٹی کا گارا اور چونا استعمال کیا گیا ہے۔ نوکوٹ قلعے کے دو حصے ہیں ایک فوجی اور انتظامی حوالے سے اہمیت کا حامل تھا تو دوسرا رہائش کے لیے مختص تھا۔ قلعے کی دیواریں چوڑی اور کشادہ ہیں۔ دیکھ بھال نہ ہونے کے باعث اندرونی حصے کی دیواروں میں دراڑیں پڑ گئی ہیں۔

مغربی فصیل کے اندرونی حصے میں تالپور حکمرانوں کے محلات اور بارہ دری وغیرہ دیکھ بھال نہ ہونے کی وجہ سے منہدم ہو چکی ہیں۔ اس قلعے کے آہنی چٹان جیسے نو مضبوط برج اور دو

مرکزی دروازے ہیں، تین برج شمال، جنوب اور مغربی دیوار کے درمیان ہیں۔ ان برجوں میں سب سے مضبوط برج کا قطر (ڈایامیٹر) ۴۴ء۶ فٹ اور اس کا گھیراؤ (سرکمفرنس) ۱۳۹ فٹ ہے۔

شاہی دروازے سے اندر داخل ہونے کے بعد وسیع احاطے کے ساتھ سامنے اور دائیں طرف طویل سرنگ نما برآمدے اور کمانی دار چھت والی بیرک نما کوٹھریاں بنی ہوئی ہیں، جن میں کوئی کھڑکی نہیں ہے اور نہ ہی روشنی کا کوئی دوسرا انتظام ہے۔

کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ ان میں بارود، بندوقوں اور توپوں کا ذخیرہ رکھا جاتا تھا جبکہ کچھ کا کہنا ہے کہ ان میں خطرناک قیدیوں کو رکھا جاتا تھا یا پھر یہاں پھانسی گھاٹ ہوا کرتا تھا۔ پھانسی گھاٹ ہونا اس لیے خارج از امکان نہیں ہے کیونکہ ان بیرک نما کوٹھریوں کی چھتوں پر کچھ لوہے کے کڑے لگے ہوئے ہیں جبکہ بیٹھنے کے لیے اینٹوں کی نشستیں بھی تعمیر کی گئی ہیں۔ نوکوٹ قلعہ میں مختلف مقامات پر فوجی بیرکیں بھی تعمیر کی گئی تھیں، جہاں تالپوروں کی فوج کے سپاہی رہا کرتے تھے مگر اب ان کی حالت انتہائی شکستہ ہے۔

انگریزوں نے جب اس علاقے پر قبضہ کیا تو اس علاقے کو آباد کرنے کے لیے قلعے کے جنوب میں کئی چھوٹی چھوٹی عمارتیں اور ایک بازار تعمیر کروانے کا منصوبہ بنایا لیکن اس پر پوری طرح عمل نہ ہوسکا کیونکہ ۱۹۳۸ء میں ریلوے لائن بچھنے سے اسٹیشن تقریباً ۶ میل دور بنا اور لوگ بھی ذرائع نقل و حمل کی آسانی کی وجہ سے وہیں آباد ہوگئے۔

قلعہ نوکوٹ عرصہ دراز تک مضبوط قلعہ سمجھا جاتا رہا لیکن وقت کے بے رحم تھپیڑوں اور حکومت کی عدم توجہ کی وجہ سے اب یہ خستہ حال ہوچکا ہے۔ محلات، بارہ دری

اور قدیم پھانسی گھاٹ سمیت قلعے کے دیگر حصے منہدم ہو چکے ہیں جبکہ اندرونی حصے کی دیواریں بوسیدگی کا شکار ہیں اور ان میں دراڑیں پڑ گئی ہیں۔ اس تاریخی قلعے کو اصل حالت میں قائم رکھنے پر توجہ دے کر اسے سیاحتی مرکز کے طور پر پیش کیا جا سکتا ہے۔

قلعہ سیہون:

سندھ میں متعدد تاریخی مقامات اور مختلف عبادت گاہوں کے ساتھ بزرگانِ دین کے مزارات بھی بڑی تعداد میں موجود ہیں۔ ان میں سندھی زبان کے نام وَر صوفی

شاعر، حضرت لعل شہباز قلندر کا مزار خصوصی اہمیت کا حامل ہے، جہاں ہمہ وقت زائرین کا ہجوم رہتا ہے۔ بلاشبہ، سندھ کی تاریخ لعل شہباز قلندر کے بغیر نامکمل ہے۔ اُن کا اصل نام حضرت سیّد عثمان مروندی ہے۔ تاریخی روایات سے پتا چلتا ہے کہ آج کا سیہون شریف، لعل شہباز قلندر ہی کی وجہ سے بین الاقوامی شہرت کا حامل ٹھہرا۔ ماضی میں یہ قدیم شہر، سنڈیمن، سنڈیمانا، شوآستان، سیوستان اور سیستان کے مختلف ناموں سے پکارا جاتا رہا۔ تاہم، آج سیہون کے نام سے جانا جاتا ہے۔

مشہور سیاح ابن بطوطہ ۱۳۳۳ء میں یہاں آئے تھے۔ وہ سیہون کو ریگستان میں بَسے ایک بڑے اور زبردست شہر کا اعزاز دیتے ہیں مگر ساتھ ہی سیہون کی گرمی کا تذکرہ بڑی ہی بے دلی سے کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ 'ہم جب یہاں پہنچے تو گرمی انتہائی نہایت سخت پڑتی تھی۔ میرے ساتھی جسم کو ٹھنڈا رکھنے کے لیے ایک کپڑا گیلا کر کے جسم پر لپیٹتے تھے اور دوسرا کپڑا پانی میں بھگو کر ساتھ رکھتے جیسے ہی پہلے والا کپڑا خشک ہو جاتا تو دوسرا گیلا کپڑا لپیٹ دیتے'۔

اس قلعے کی تاریخ کی بابت بین الاقوامی سیاح اور محققین مختلف آرا رکھتے ہیں جبکہ مقامی محققین کی آرا بھی موجود ہیں جسے تاریخ کے طالبعلموں اور نوجوان نسل کو جاننا ضروری ہے۔ قلعے کے اصلی نام سے بھی لوگ ناواقف ہیں، جس کو سکندر کا قلعہ، کافر قلعہ، پرانا قلعہ یا اب سیہون کا قلعہ کہا جاتا ہے، جبکہ مقامی لوگ اس مقام کو "الٹی بستی" کے نام سے جانتے ہیں۔

تاریخ کے اوراق آج بھی سیہون کے قدیم ترین ہونے کے شواہد دیتے نظر آتے ہیں۔ ۳۲۶ قبل از مسیح میں سیہون کا حکمران راجا سامبس تھا۔ راجا سامبس نے سکندر کے خلاف بغاوت کی تھی۔ تاریخ کے مطابق سامبس کا تعلق بدھ مت سے تھا۔ اس زمانے میں اس شہر کا نام سنڈیمن تھا۔ قلعے کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ قلعہ سکندر اعظم نے تعمیر کیا تھا اور اسی وجہ سے اسے سکندر کا قلعہ بھی کہا جاتا ہے۔ جبکہ بہت سے محققین کی رائے ہے کہ جب سکندر اعظم سندھ میں داخل ہوا تو یہ قلعہ موجود تھا۔ ایک اندازے کے مطابق یہ قلعہ رائے سہاسی دوئم کے زمانے ۶۰۰ سال قبل عیسوی تعمیر کیا گیا تھا۔ اس کے بعد اس قلعے کو ۷۱۳ میں محمد بن قاسم نے فتح کیا تھا، جب راجا داہر کو شکست ہوئی تھی۔ جبکہ ۱۵۲۰ کے زمانے میں شاہ بیگ ارغون نے سمہ حکمرانوں سے سیہون خالی کروایا تھا۔ مگر محققین اس بابت کہنے سے قاصر ہیں کہ کب اور کس طرح اس قلعے کا زوال شروع ہوا۔ صرف سینہ بہ سینہ کہانیاں مشہور ہیں۔ آج اس قلعے کی خستہ حال بچی کچھی دیواریں شکست اور تباہی کی کہانی بیان کرتی ہیں۔

فرانسیسی آثار قدیمہ کے ماہر پروفیسر ڈاکٹر مونک کیروران نے سیہون کے قلعے پر بہت کام کیا۔ انہوں نے ۲۰۰۲ اور ۲۰۰۳ میں محکمہ آثار قدیمہ کے زیر نگرانی کھدائی کی تھی اور اس وقت نکلنے والے نوادارت سیہون میوزیم میں رکھے ہوئے ہیں۔ محکمہ آثار قدیمہ و ثقافت نے ایک ریسٹ ہاؤس بھی بنایا ہوا ہے تاکہ سیہون آنے والے محققین کو سہولیات فراہم کی جاسکے۔

محققین کے مطابق اس قلعے میں ٹھٹھہ کے قلعہ کلیان کوٹ جیسی اینٹوں کا کام ہے۔ جبکہ بعض محققین کا کہنا ہے کہ اس کے بھی شواہد موجود ہیں کہ سکندر کے ہندوستان آنے سے قبل یہ قلعہ موجود تھا اور شاید اس نے اپنی فوج کی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے اس کی مرمت کی تھی۔ قلعے کے محراب اور دیگر خصوصیات مشرقی ہیں، نہ کہ گریسیائی۔ ٹھٹھہ کے کلیان کوٹ قلعے کی طرح اینٹوں کا کام، اور "کافر قلعہ" نام بھی اس حقیقت کی نشاندہی کرتا ہے کہ سیہون فورٹ ہندو حکمرانی کے دوران تعمیر ہوا تھا۔

ڈاکٹر مائیکل بوؤین کے مطابق اس علاقے میں فرنچ اسکالرز نے لمبے عرصے تک تحقیق کی مگر ابھی تک ہم اس کے حقائق تک نہیں پہنچ سکے ہیں۔ تاریخ پر لکھنے اور ان کی باقیات کو بچانے کے لیے کوشاں آچر خاصخیلی کے مطابق اس قلعے میں بچانے کے لیے اب کچھ بھی نہیں بچا ہے۔ ہاں مگر یہاں پر کھدائی کر کے اس کی حقیقت کو عوام کو سامنے لایا جانا ضروری ہے۔ یہ بھی ہمارا سرمایہ اور تہذیب کے چھپے راز کو سامنے لانے میں ایک سنگ میل ثابت ہو گا۔

آج اس گمنام قلعے میں وہ طلسمی کشش باقی نہیں ہے جو سندھ کے دوسرے قلعوں میں ہے۔ اس کی بڑی وجہ یہاں اس کی باقیات کا نہ ہونا ہے۔ سیہون میں آنے والے زائرین اور تفریح کی غرض سے آنے والے عوام نے بھی اس قلعے کی باقیات کو ختم کرنے میں بڑا کردار ادا کیا ہے۔ در و دیوار سے ہی قلعے و محلات کو پہچانا جاتا ہے۔ اس بدنصیب قلعے کی تو دیواریں ہی نہیں ہیں، تو دروازے دور کی بات ہیں۔ اب یہ قلعہ مٹی کا کوئی بہت بڑا سا ڈھیر لگتا ہے۔ ایسا مٹی کا قلعہ جس کے برج مٹی کے، دیواریں مٹی کی اور فصیلیں مٹی سے بنی

ہوں۔ اب صرف کہیں کہیں ہی پکی اینٹیں قلعے کی دیواروں میں گڑی ہیں، باقی تو سب کچھ ختم ہو چکا ہے۔ اور سندھ واسیوں نے موقع غنیمت جان کر قریب کی زمین پر قبضہ کر لیا ہے۔ صرف مختصر سا حصہ ہے جو علامتی طور قلعے کے ہونے کا یقین دلاتا ہے۔

قاسم فورٹ / منوڑہ فورٹ:

برطانیہ کے قبضے سے ایک سال قبل سیاح کارلیس نے لکھا تھا کہ 'کراچی بندرگاہ متعدد ندیوں اور نالوں کا نتیجہ ہے جو قریب میں پہاڑیوں سے نکل کر ساحل کی جانب بہتے ہیں اور ساحل کا نشیبی حصہ کاٹ کر پانچ میل لمبی خلیج بناتے ہیں اور شمالی حصے میں جہاں دلدل اور جھیلیں ہیں یہ خلیج دس میل لمبی ہو جاتی ہے اور اس کا کچھ حصہ جہاز رانی کے قابل ہے باقی حصہ پانی اتر جانے کے بعد کسی حد تک پایاب ہو جاتا ہے۔'

'اس پہاڑی نما چٹان کی چوٹی پر جس کو منوڑا کہتے ہیں ایک قلعہ، ایک مسجد اور چند دیگر عمارتیں ہیں۔ بندرگاہ کی حفاظت گول مینارہ کرتا ہے جو ان عمارتوں سے آدھ میل دور واقعہ ہے۔ کیاماڑی اور منہوڑا کا درمیانی علاقہ کراچی کی اصلی بندرگاہ ہے اور اسی علاقے میں ہر قسم کے جہاز لنگر انداز ہو سکتے ہیں۔'

چارلس میسن جس نے سنہ ۱۸۳۰ میں یہاں کا دورہ کیا تھا مزید لکھا کہ 'قلعہ منوڑہ کے گرد برج بنائے گئے ہیں، دیوار کے اندر جگہ جگہ توپوں کے لیے سوراخ بنے ہوئے ہیں اور جوکھیو قبیلے کے ایک سو سپاہی شہر کے گورنر حسن خان کے حکم سے تعینات ہیں اور قلعے کے اندر میٹھے پانی کا نام ونشان تک نہیں ہے۔ حفاظتی دستے کے لیے پانی شہر سے لانا پڑتا ہے اور اس مقام سے تھوڑا آگے وہ پہاڑی آتی ہے جس پر قلعہ تعمیر کیا گیا۔'

'یہاں پتھر کا ایک برج ہے جس پر چار توپیں نصب شدہ ہیں جو اندر آتے ہی جہاز کے بائیں جانب ہیں۔ بندرگاہ اور شہر کا حفاظتی انتظام انتہائی کمزور ہے اس کو تباہ بھی کیا جا

سکتا ہے اور نظر انداز بھی کیا جا سکتا ہے کیونکہ لشکر ریت کے نشیبی علاقے میں اتر سکتا ہے اور منوڑہ کو محض قلت آب کے باعث ہتھیار ڈالنے پر مجبور کیا جا سکتا ہے۔'

وہ لکھتے ہیں کہ 'شہر کے باسیوں کو قلعے کے برجوں پر ناز ہے جن پر بے کار اور زنگ خوردہ چالیس توپیں جمائی گئی ہیں۔

قلعے میں شگاف پڑ گئے ہیں اور یہ بیرونی حملے کی تاب نہیں لا سکتا۔ بہت سے برج مٹی کے تودے ہیں اور دیوار میں اتنے بڑے شگاف پڑے ہوئے ہیں کہ لوگ ان کو رفع حاجت کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔'

لیفٹینینٹ ہنری پوٹنجر جو ۱۸۰۹ میں کراچی آئے تھا اپنے سفر نامے 'بلوچستان و سندھ' میں لکھتے ہیں کہ 'سنہ ۱۷۹۷ میں تعمیر کردہ یہ قلعہ خلیج کے طور پر استعمال کیا جائے تو دشمن کا کوئی جہاز بندرگاہ میں داخل نہیں ہو سکتا لیکن اس کی قلعہ بندیاں بہت کمزور اور بے قاعدہ ہیں اور اکثر جگہوں پر یہ پانچ چھ فٹ سے زیادہ بلند نہیں اور ایک گھڑ سوار نہایت آسانی سے ان کے اوپر سے جست لگا کر اندر آ سکتا ہے۔'

پکا قلعہ حیدر آباد:

حیدر آباد شہر اپنی تاریخی حیثیت سے سندھ کا وہ مرکز رہا ہے، جس کو علم، ادب، تعلیم، ثقافت اور سیاست کی وجہ سے ہمیشہ اعلیٰ مقام ملا۔ اس شہر کی اپنی تاریخ ہے، جب وہ حیدرآباد کے بجائے نیرون کوٹ کے نام سے جانا جاتا تھا۔ سندھی میں کوٹ کے معنی قلعہ بنتی ہے اور نیرون یہاں کے حکمران کا نام تھا، جو بدھ دھرم سے تعلق رکھتا تھا۔ نیرون

بادشاہ کا شہر کے وسط میں اونچے مقام پر واقع قلعہ تھا، جس میں اس کے پہریدار اور خاندان کے افراد رہتے تھے۔

انسانی تہذیب کی کہانی کو پڑھا جائے تو اس میں قلعے، محل اور دیگر عالیشان عمارتیں دنیا کے ہر خطے میں نظر آجاتے ہیں۔ اپنے اپنے ادوار میں عوام پر حکمرانی کرنے والے بادشاہوں نے جہاں ان قلعوں میں رہ کر راج کیا ہے، وہاں انہوں نے خود کو تحفظ فراہم کرنے کے لیے بھی مختلف مقامات پر قلعے بنوائے۔ مگر آج ان قلعوں کی حالت دن بدن بگڑتی جارہی ہے۔

ایسا لگتا ہے کہ وقت کے زور کے آگے یہ قلعے اپنے گھٹنے ٹیک چکے ہیں۔ قلعوں کی دنیا جہاں رنگینیوں سے بھرپور ہوا کرتی تھی وہیں محلاتی سازشوں کے قصے بھی انہیں قلعوں کی اونچی دیواروں اور حرم کے اندر پنپتے رہتے تھے۔ پھر ایک روز ایسا بھی آتا ہے کہ تخت گرائے جاتے ہیں اور تاج اچھالے جاتے ہیں۔ لہٰذا یہ قلعے ایسے ویران ہو جاتے ہیں جیسے کبھی آباد تھے ہی نہیں۔ مگر ہر حکمران کے عروج وزوال کی اپنی اپنی کہانی ہوتی ہے۔

نیرون بادشاہ کے بعد راجہ ڈاہر کے زمانے میں شمنی نامی حکمران کا یہاں راج تھا۔ اسی زمانے میں محمد بن قاسم نے سندھ پہ حملہ کیا تھا مگر نیرون کوٹ پہ عرب فوج نے چڑھائی نہیں کی کیونکہ شمنی نے، حجاج بن یوسف سے محمد بن قاسم کے حملے سے قبل ہی ان کی حمایت کرکے، ساتھ دینے کی ضمانت دی تھی، جس پہ حجاج بن یوسف سے شمنی نے امان کا پروانہ حاصل کر لیا تھا جو نیرون کوٹ پہنچنے پر عرب فوج کو دکھا کر کارروائی رکوا دی۔ بعد میں یہاں عرب حکومت قائم ہوگئی پھر بھی اس شہر کا نام نیرون کوٹ ہی رہا۔

اس شہر کا نام نیرون کوٹ سے حیدرآباد ۱۷۶۹ء میں عباسی گھرانے سے تعلق رکھنے والے حکمران میاں غلام شاہ کلہوڑو نے رکھا۔ اس دور میں حیدرآباد میں یادگار کام ہوا۔ شہر کو دارالحکومت کا درجہ ملا ہوا تھا اس لئے تمام تعمیراتی کام ہوئے۔ ہندستان میں مغلوں کی حکومت تھی۔ مغلیہ عمارت سازی کی تب روایت چل رہی تھی اس لئے سندھ میں بھی وہی طرز تعمیر نظر آتی ہیں۔

حیدرآباد کو روشن دانوں کا شہر بھی کہا جاتا تھا، یہاں کے ہر گھر کی چھت پر روشندان ہوتا تھا، جہاں سے چوبیس گھنٹے ہوا آتی رہتی تھی۔ روشندان کو سندھی زبان میں "منگھ" کہتے ہیں اور یہ منگھ عام روشندان کے مقابلے میں اس طریقے کا ہوتا تھا کہ یہاں سے دھوپ اور بارش کا پانی گھروں میں داخل نہیں ہوتا تھا۔ حیدرآباد کی قدیم تصاویر میں منگھ آپ دیکھ سکتے ہیں۔ اونچائی پر آباد یہ شہر ہمیشہ سے ہوادار رہا ہے۔ دن شدید گرم ہونے کے باوجود بھی حیدرآباد کی راتیں ٹھنڈی ہوتی ہیں، جس کی وجہ اس کے درمیان سے دریائے سندھ کی گزر ہے۔

آج کے جدید دور میں حیدرآباد ایک بڑی آبادی والا شہر بن چکا ہے، مگر دن بدن سکڑتا جارہا ہے۔ گھر، دکانیں، بازار اور راستے سب کچھ بے ترتیب بنتے جارہے ہیں۔ ایک صدی پہلے حیدرآباد کی آبادی تیس ہزار تھی اور آج اسی شہر کی آبادی ۳۰لاکھ سے زیادہ کی ہے۔

حیدرآباد میں اس تاریخی پکا قلعہ کے چند ایک آثار آج بھی محفوظ ہیں، جو اپنے وقت کی یادگار ہیں۔ پکا قلعہ ۱۷۶۹ء میں حاکم وقت غلام شاہ کلہوڑو نے تعمیر کروایا تھا۔ پکا قلعہ کے لیے مزدور قندھار سے منگوائے تھے۔ اس قلعے کے کاریگر ملتان سے آئے تھے۔

قلعے میں اندر جنگی سامان اور لوہے کے بھاری بھر کم دروازے نصب کروائے۔ شاہی دربار، سپاہیوں کی رہائش، حکمران خاندان کی رہائش، وزراء و امراء کی رہائش، باغات، میدان اور شاہی بازار قائم کروائے۔

پکا قلعہ کے سامنے شاہی بازار آج بھی موجود ہے جو اس زمانے میں پکے قلعے کی حدود میں واقع تھا۔ کلہوڑا حکمرانوں کے بعد میر یا تالپور حکومت قائم ہوئی۔ انہوں نے بھی حیدرآباد کو ہی دارالحکومت کا درجہ دیا اور ماضی کے حکمرانوں سے زیادہ حیدرآباد کی خدمت کی۔ انہوں نے پکا قلعہ کی مزید تعمیر کی۔ خصوصی طور پہ جنگی ساز و سامان کا اہتمام زیادہ کیا۔ میر صاحبان کی طاقتور حکومت تھی۔ ان کے فارس اور عربستان سے تعلقات بہت اچھے رہے۔

میر صاحبان میں مذہبی رجحان زیادہ نظر آیا۔ دربار میں شعر و سخن کی نشستیں معمول تھا۔ فارسی ان دنوں دفتری زبان کا درجہ رکھتی تھی۔ ان کی فوج پہ بھی خاص توجہ رہی جنگی ہتھیار بیرون ممالک سے خریدتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ جب انگریزوں نے سندھ پر حملے کیے تب ہر حصے میں ان کو مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا۔ اور آخر کار ۱۸۴۳ء میں انہوں نے سندھ پر قبضہ کر ہی لیا۔ اسی تاریخی پکے قلعے پر پھر انہوں نے برطانوی جھنڈہ بھی نصب کر لیا۔

انگریزوں نے بھی حیدرآباد کو دارالحکومت کے طور پر استعمال کیا۔ چارلس نیپیئر نے پکا قلعہ میں اندر انگریز حکمرانوں کی فوج کا مرکز قائم کر دیا گیا۔ یہاں ان کی فوج کے تمام اعلیٰ عہدیدار بیٹھتے تھے اور سارے سندھ کا عسکری نظام چلایا کرتے تھے۔ ماضی کے

حکمرانوں کی شاہی دربار اور رہائش اب انگریز فوجیوں کے دفتر بن چکے تھے۔ اس پورے دور میں پکا قلعہ کی تعمیرات کے حوالے سے کوئی کام نہیں ہوا۔ انگریزوں نے جاتے جاتے ماضی کے تمام حکمرانوں کا مال و دولت تو لیا مگر تاریخی جنگی ساز و سامان، فوجی لباس، قیمتی و نایاب اشیاء و تحائف، کتب سمیت سب کچھ سمیٹ کر برطانیہ لے گئے، ان میں سے کئی چیزیں برطانوی عجائب گھر میں محفوظ ہیں۔

قیام پاکستان کے بعد ہندوستان سے ہجرت کر کے آنے والے خاندانوں کو اس قلعے میں عارضی طور پہ رہائش پذیر کیا گیا مگر بعد میں انہوں نے یہاں مستقل قیام اختیار کر لیا۔ آج اس قلعے کی حالت زبوں حال ہوتی جارہی ہے۔ کئی گھروں کو نقصان بھی اٹھانا پڑا ہے۔ چاروں اطراف سے ضعیف حالت میں ہونے کی وجہ سے رہنے والوں کو بھی خطرہ لاحق ہے۔ ڈھائی سو سال گزرنے کے بعد اب پکا قلعہ کی وہ مضبوطی ختم ہو چکی ہے۔ اس قدیم قلعے سے جو صدیوں پرانی عروج وزوال کی تاریخ وابستہ ہیں، اس کو کبھی فراموش نہیں کیا جاسکتا۔

پکا قلعے میں تقریباً ۵ لاکھ نفوس آباد ہیں کسی زمانے میں قلعہ کے گرد ایک مضبوط مکمل فصیل بھی تعمیر کی گئی تھی مگر آج یہ فصیل جگہ جگہ سے گر گئی ہے اور یہ سلسلہ جاری ہے اکثر اوقات اس کے گرنے سے انسانی زندگیاں خطرے سے دوچار رہتی ہیں قلعے کی عمارت صدر دروازے قلعہ چوک سے شروع ہو کر درگاہ مولانا علی قدم گاہ سٹیشن روڈ، فقیر کا پڑ سے گزر کر واپس صدر دروازے پر ختم ہوتی ہے۔ قلعے کے باہر درگاہ قدم مولا علی ہے یہ زیارت جو پتھر کی سل ہے دراصل قلعے کے اندر موجود تھی جس سے میر صاحبان کے

اہل خانہ مشرف بہ زیارت ہوا کرتے تھے۔ لیکن سندھ کے آخری بادشاہ میر نصیر خان تالپور نے عام لوگوں کے اصرار پر اسے یہاں نصب کروادیا ہے یہ سل دراصل روایت کے مطابق حضرت علیؓ کے نماز پڑھتے ہوئے ہاتھوں اور پیروں کے نشانات ہیں جو گہرے اور واضح ہیں تواریخ کے مطابق یہ پتھر عراق سے گزر کر ایرانی بادشاہ اسماعیل قاچار کے پاس تبرکاً آیا تھا جو اس نے تحفتاً سندھ کے بادشاہ میر فتح علی خان تالپور کو دیا تھا اس طرح دوسری روایت کے مطابق حضرت علیؓ براستہ لاہوت حیدر آباد تشریف لائے تھے اور یہاں سے سیہون شریف بھی گئے تھے اس لیے آج بھی سیہون میں جس مقام پر آپؓ ٹھہرے تھے وہ مقام علی جاپٹ کہلاتا ہے۔ قلعے کی فصیل کے نیچے گھومتے ہوئے حصار میں دکانیں بنادی گئی ہیں جہاں بسا اوقات فصیل کے اچانک منہدم ہونے سے نقصانات ہوتے رہتے ہیں۔ قلعے کے اندر ایک سٹیڈیم بھی موجود ہے۔ اس قلعے میں زیادہ تر وہ مہاجرین آباد ہوئے جو ۱۹۴۷ء میں ہجرت کرکے پاکستان تشریف لائے تھے۔ آہستہ آہستہ قلعہ میں رہائش کے ساتھ ساتھ چھوٹی چھوٹی صنعتیں بھی لگتی رہی۔ جن میں چوڑی کے شعبے کے کارخانے اور جوتا سازی کے کارخانے شامل ہیں، یہ قلعہ کسی زمانے میں علمی کتابوں سے مالا مال تھا مگر اب کوئی لائبریری موجود نہیں حالانکہ اس قلعے میں ممتاز ادیب دانشور اور سب دیوان شاعر میر محمد شیر خان بن مراد علی خان، والئی حیدر آباد ۱۸۰۴ء میں پیدا ہوئے تھے۔ جو جعفری تخلص رکھتے تھے ان کی مشہور زمانہ کتابیں یہ ہیں۔ دیوان فارسی ۱۲۳۳ء دیوان اردو ۱۲۶۱ء سفر نامہ جعفری ۱۲۶۰ء مکاتیب جعفری خطوط کا مجموعہ مثنوی مرزا صاجان، مثنوی مختار نامہ ۱۲۴۱ء شامل ہیں قلعے میں ایک میوزیم بھی تھا جس کی عمارت آج بھی موجود ہے ۱۹۸۵ء میں قلعے میں موجود اس میوزیم کو ختم کر دیا گیا اس عمارت کے ساتھ

دیوان خاص اور دیوان عام موجود ہیں۔ قلعہ حیدر آباد ایک طویل تاریخ کا باب ہے جس میں امن و آتش، ادب و تاریخ، تہذیب و تمدن اور صحت مند معاشرے کے امنٹ نقوش موجود ہیں۔

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس قلعے کی ضعیفی نے اس کو اتنا نقصان نہیں پہنچایا جتنا لوگوں نے اس کی مضبوط در دیوار کو ہاتھ سے نقصان پہنچایا ہے۔ ۱۹۸۳ میں گرونگر سے ریلوے اسٹیشن جاتے ہوئے قلعہ کی دیوار کی بالکل چوٹی والے گھر کی دیوار ٹوٹ گئی تھی۔ اس دیوار پر گھر کے اندر کافی بوجھ تھا جس کی وجہ سے وہ گھر کے سامان سمیت نیچے آ گئی تھی۔ سال ۲۰۱۵ میں پکا قلعہ کی قدم گاہ مولا علی علیہ سلام کی جانب سڑک سے جو دیوار ہے اس کا بڑا حصہ دکانداروں نے رات کے اندھیرے میں، گودام بنانے کے لئے توڑا تھا۔

جب آدھی رات کو قلعہ کی دیوار جو پہاڑی بھاری بھرکم پتھروں سے بنی ہوئی تھی، بے تحاشا وزن دار ہونے کی وجہ سے آدھی رات کو نہیں اٹھائے جا سکے تو صبح کو یہ ماجرا معلوم ہوا۔ سندھی اخبارات نے اس بات کو ایشو بنا کر اٹھایا تو تحقیقاتی کمیٹی بنا دی گئی مگر نتیجہ صفر آیا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ اس کام میں انتظامیہ کا بھی ہاتھ تھا۔ اس کے بعد جون ۲۰۲۱ میں پکے قلعے کا مرکزی دروازہ اکھاڑ کر توڑنے کی رپورٹ اخبارات میں نظر آئی۔

معلوم ہوا کہ قلعہ کی دیوار کو ایک مرمتی کام کے لئے ٹھیکے پر دیا گیا تھا جس نے تاریخی دروازہ توڑ دیا۔ اس کے ساتھ ساتھ تاریخی دیوار کو بھی گرا کر، ایک طرف اس کا ملبہ جمع کر دیا۔ بعد ازاں دروازے کے حوالے سے اخبارات میں رپورٹ آئی تو ذمہ دار کو تنبیہ

کر دی گئی اور دروازے کو بہتر طریقے سے نصب کر دیا گیا۔ مگر اس تاریخی دروازے کے توڑنے پر ادبی، صحافتی، تحقیقی، تاریخی و ثقافتی حلقوں سے شدید مذمت ہوئی۔

کچا قلعہ حیدر آباد:

حیدرآباد میں ایک اور بھی تاریخی قلعہ ہے، جس کو کچا قلعہ کے نام سے جانا جاتا ہے۔ اس قلعے کی تعمیر بھی سندھ کے حکمران غلام شاہ کلہوڑو نے اپنے دور میں کروائی۔ شمس العلماء مرزا قلیچ بیگ نے کچا قلعہ کی تعمیر کا سال ۱۷۷۲ء درج کیا ہے۔ انہوں نے یہ بھی معلومات دی ہے کہ اس قلعے کی تعمیر میں بھی پکا قلعہ کے مزدور شامل تھے، جنہوں نے پکا قلعہ کی دو سال میں تعمیر مکمل کرنے کے بعد کچے قلعے کو تعمیر کیا۔ اس قلعہ کو “کچا” اس لئے کہا جاتا ہے کہ اس قلعے کی لمبی لمبی دیواریں مٹی سے تعمیر کی ہوئی ہیں۔

قدیم زمانے کی اینٹوں کا حال موسم کی سختیوں کی وجہ سے ضعیف ہوتا جا رہا ہے۔ اس تاریخی قلعے کا نقشہ اوپر سے دیکھا جائے تو تکونا لگتا ہے۔ قلعے کی اونچی دیواروں کو، پکی

اینٹوں کی بنیاد پر کھڑا کیا گیا ہے۔ ڈھائی صدیاں گزرنے کے بعد بھی کچا قلعہ اپنی آخری سانسیں لے رہا ہے۔ افسوس اس بات کا ہے کہ اس قلعے کی بیرونی دیواروں اور سیڑھی پر کئی دکانیں موجود ہیں جن کا کاٹھ کباڑ وہیں رکھا ہوا ہے۔ جس وجہ سے بھی قلعے کی دیواروں کی اصل ساخت کو نقصان پہنچ رہا ہے۔ کچا قلعہ کے مرکزی دروازے کو مستقل بند کیا گیا ہے، وجہ سمجھ سے بالاتر ہے۔ سندھ کے اس تاریخی قلعے کو محفوظ بنانے کے لئے متعلقہ محکموں کوشش لینی چاہیے تاکہ سندھ کا یہ تاریخی ورثہ مزید تباہی سے بچ سکے۔

اس قلعے کی دیوار سے متصل ایک چھوٹی باؤنڈری میں بزرگ سید محمد مکی کا مزار ہے۔ اس بزرگ کو مکی شاہ یا شاہ مکی اور جیئے شاہ کے ناموں سے بھی پکارا جاتا ہے۔ سندھ کے مورخین کے مطابق مذکورہ بزرگ مکہ مکرمہ میں پیدا ہوئے تھے اور اسلام کی تبلیغ میں نیرون کوٹ تک آ گئے اور پھر زندگی کے آخری ایام تک انہوں نے اسلام کی روشنی پھیلائی۔ کچا قلعہ کے حوالے سے ”لب تاریخ سندھ“ میں لکھا ہوا کہ کچا قلعہ کی بنیاد اصل میں بزرگ اولیاء شاہ محمد مکی نے ڈالی تھی مگر بعد میں اس کی تعمیر نو غلام شاہ کلہوڑو نے کروائی۔

سندھی لوک ادب میں بھی اس بزرگ کے حوالے سے ایک طویل قصہ ملتا ہے۔ سندھی ادبی بورڈ نے ۱۹۶۴ع میں ”مشہور سندھی کتھا“ کے نام سے ایک کتاب شائع ہوئی جس کو سندھ کے نامور محقق ڈاکٹر نبی بخش بلوچ نے مرتب کیا تھا۔ اس کتاب میں ”مل محمود ائیں مہر نگار“ کے عنوان سے قصہ ملتا ہے۔ ڈاکٹر بلوچ صاحب اس حوالے سے ابتدائی صفحات میں لکھا ہے: ”یہ قصہ سندھ میں قدیم وقت سے رائج ہے اور مشہور درویش شاہ محمد

مکی عرف جیئے شاہ (مدفون کچا قلعہ، حیدرآباد، سندھ) سے منسوب ہے۔ اس قصے کی دو روایات ملتی ہیں، جو درج ذیل ہیں۔

بنیادی قصہ غالباً وہی ہے جو رفتہ رفتہ مکانی طور پہ تبدیل ہوا۔ شاہ محمد مکی کی سندھ میں آمد حضرت علی علیہ کے دور خلافت میں ہوئی۔ اس وقت ان کی حاکم وقت راجہ نیرون سے لڑائی اور حضرت علی علیہ کا سندھ میں آکر ملک محمود کی مدد کرنا، ظاہراً فرضی کہانی ہے جو تاریخی اعتبار سے درست نہیں۔"

شاہ مکی کی قبر عام قبروں سے زیادہ لمبی ہے، جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ بزرگ شاہ مکی دراز قد تھے۔ مزار کا گنبد سبز اور سفید رنگ کا ہے۔ اس بزرگ کے مزار کی تعمیر بھی غلام شاہ کلہوڑو نے کروائی تھی۔ سندھ کے اس حکمران نے اپنے عہد میں لاتعداد اولیائے کرام کے مزارات تعمیر کروائے تھے، ان میں سے ایک سید محمد مکی کا مزار بھی ہے۔

قلعہ عمرکوٹ:

قدیم تہذیب کی حامل سندھ دھرتی پر بھی صدیوں قدیم ۳ بڑے قلعے ہیں، جن میں کوٹ ڈیجی، رنی کوٹ اور عمرکوٹ شامل ہیں۔

عمرکوٹ کے قلعے کے مناظر دیکھنے والوں کو آج بھی مبہوت کر دیتے ہیں، یہ قلعہ اپنی بناوٹ، خوبصورتی اور کشش کی وجہ سے نہ صرف برصغیر بلکہ دنیا بھر میں مقبول ہے۔ سندھ کے ضلع عمرکوٹ کی وجہ شہرت تو اس دھرتی پہ مغل شہنشاہ اکبر کی پیدائش اور عمر ماروی کی داستان ہے مگر عمرکوٹ کا تاریخی قلعہ یہاں کی ہمیشہ پہچان رہا ہے۔ اس قلعہ سے

عمر ماروی کی مشہور لوک کہانی بھی وابستہ ہے۔ اس قلعہ کی سب سے خاص بات یہ ہے کہ عمر کوٹ قلعے کو اکبر اعظم سے تعلق کی وجہ سے اسے دور اکبری کی یاد گار بھی کہا جاتا ہے۔

تاریخ کے اوراق یہ بتاتے ہیں کہ عمر کوٹ کا چھوٹا سا قصبہ جو ریت کے ٹیلوں کے کنارے پر سندھ کے مشرقی صحرا کو الگ کرتا ہے، یہاں شہنشاہ جلال الدین محمد اکبر کی جائے پیدائش ہے۔ یہ جگہ ایک چھت دار احاطہ سا ہے جو ۱۸۹۸ میں مقامی زمیندار سید میر شاہ نے تعمیر کرایا تھا اس کے مشرقی جانب پتھر کا گنبد موجود ہے۔ یہ جگہ بادشاہ اکبر کے اعزاز میں یاد گار کے طور سے بنائی گئی جو ۱۵۴۲ء میں یہاں پیدا ہوا، یہ تعمیر پختہ اینٹوں سے کی گئی ہے، جس کے اوپر گنبد نما چھت ہے عمر کوٹ کے قلعے میں قائم میوزیم میں موجود ہتھیار، زیورات، سکے شاہی فرمان اور خطاطی کے نمونوں کے علاوہ مجسمے قدیم دور کی داستان سناتے ہیں۔ تاریخ کے دریچوں میں جھانکا جائے تو بعض لوگ کہتے ہیں کہ موجودہ قلعہ پہلے یہاں نہ تھا بلکہ اکبر بادشاہ کی جائے پیدائش والے پتھر کے پاس تھا، یہ غلط ہے۔ قلعہ اصل میں موجودہ مقام پر ہی موجود تھا، جس کے ثبوت کے لئے یہ کافی ہے کہ منجنیق کے گولے اسی قلعہ کے اندر سے ملے ہیں۔ اکبر بادشاہ کی جائے پیدائش کے پتھر کے اطراف میں جو چھوٹی گڑھیوں کی بنیادوں کے نشانات ملتے ہیں وہ ان سرداروں کی چھوٹی چھوٹی گڑھیاں تھیں جو اس پایہ تخت کے ارد گرد تعمیر کروایا کرتے تھے۔

تاریخی حوالوں سے پتہ چلتا ہے کہ عمر کوٹ یا امر کوٹ کا قلعہ ۱۴ ویں صدی عیسوی میں عمر کوٹ کے پہلے حاکم، عمر سومرو نے تعمیر کروایا تھا، جو عمر، ماروی کی داستان کا مرکزی کردار بھی تھا۔ بعض تاریخ دانوں کے نزدیک اس قلعے کا اصل نام امر کوٹ یا امیر

کوٹ تھا اور ان کی دلیل کے مطابق یہ قلعہ ۱۴ویں صدی عیسوی سے قبل بھی موجود تھا۔ ان کا ماننا ہے کہ چونکہ یہ قلعہ امیر سرداروں اور حاکموں کی رہائشگاہ رہا ہے، اسی لیے اسے یہ نام دیا گیا جو بعد میں عمرکوٹ ہو گیا۔ کچھ محققین کے خیال میں در حقیقت امرکوٹ اور عمر کوٹ دو الگ الگ شہر تھے۔ ایک عام قیاس یہ ہے کہ راجہ امر سنگھ نے ۱۱ویں صدی عیسوی میں عمرکوٹ شہر بسایا تھا۔ جیسلمیر کی تاریخ بتاتی ہے کہ ۱۱ویں صدی عیسوی کے آغاز میں امرکوٹ پر پرماروں کی حکومت تھی۔ تیرہویں صدی کے آخر میں راجپوت حکمران پرمار سوڈھو نے اس شہر پر اپنی حکم رانی قائم کی۔ جب مغل بادشاہ ہمایوں، نادر شاہ سے شکست کھا کر عمرکوٹ پہنچا تھا تو اس کا استقبال کرنے والا رانا پرساد، اسی پرمار سوڈھو کی اولاد میں سے تھا۔ عمرکوٹ میں جو بھی حکومت کرتا تھا، اُس کو 'رانو کا خطاب دیا جاتا تھا۔ وقت گزرنے کے ساتھ راجپوتوں نے یہ قلعہ کلہوڑا حکمرانوں کے حوالے کر دیا۔ کلہوڑوں نے اسے جودھپور کے راجا کو بیچ دیا اور تالپور خاندان نے جب کلہوڑوں سے اقتدار چھین کر سندھ پر اپنی حکم رانی قائم کی تو انہوں نے ۱۸۱۳ میں جودھپور کے حکم رانوں سے یہ قلعہ واپس لے لیا۔ انگریزوں نے جب ۱۸۴۳ میں سندھ فتح کیا تو یہ قلعہ انگریز سرکار کے قبضے میں آ گیا۔

جب میاں نور محمد کلہوڑہ حاکم سندھ نے موجودہ قلعہ نئے سرے سے تعمیر کروایا تو آس پاس جو اینٹ اور پتھر ملا وہ سب لا کر اس قلعہ میں لگا دیا، اس طرح قلعہ کے سامنے جو دو پتھر ہندی تحریر والے نصب ہیں وہ بھی کہیں سے دستیاب ہوئے ہیں جو یہاں بے ترتیب چن دیے گئے تھے۔ ان پتھروں کی تحریر کا موجودہ قلعہ کی تاریخ سے کوئی واسطہ نہیں ہے۔ کچھ پتھر میاں نور محمد کلہوڑہ نے حیدرآباد کی طرف سے بذریعہ کشتیاں منگوائے تھے جو اس کی اپنی تخلیق کروائی ہوئی نہر ”نورواہ“ کے ذریعے لائے گئے تھے۔ ہو سکتا ہے کہ حیدرآباد

کے یہ پتھر گنجے ٹکڑ (پہاڑ) کے کسی مندر یا غار سے ملے ہوں، جہاں زمانہ قدیم میں ہندوئوں کا تعلق تھا۔ بعض تاریخ نویسوں کے نزدیک یہ قلعہ اصل میں امر کوٹ (امیر کوٹ) تھا چونکہ یہ امیر سرداروں اور حاکموں کی جائے سکونت رہا ہے اس لئے اسے امیر کوٹ کا نام دیا گیا تھا۔ کچھ محققین کا خیال ہے کہ امر کوٹ اور عمر کوٹ دو الگ الگ شہر تھے جب کہ کچھ لوگوں کے خیال میں یہ ایک ہی قلعہ ہے جس کو پہلے امر کوٹ اور بعد میں عمر کوٹ کے نام سے جانا جاتا ہے۔ عمر کوٹ کے قلعہ، تعلقہ اور ضلع عمر کوٹ کے بارے میں تاریخی کتب سے پتہ چلتا ہے کہ میاں نور محمد کلہوڑو نے اس قلعہ میں پناہ لی تھی۔ ۱۷۸۰ء میں یہاں عبدالنبی کلہوڑو نے راجہ جودھپور کی مدد سے میر بجار کو قتل کیا اور اس کے صلے میں یہ قلعہ راجہ جودھپور کو دے دیا گیا تھا۔ راجپوتوں سے یہ قلعہ میر غلام علی خان تالپور نے ۱۸۱۳ء میں واپس لیا۔ ۱۸۴۳ء میں اس قلعہ پر برطانوی افواج کا قبضہ ہو گیا۔

اس قلعہ سے شہر کی نگرانی کے لیے ایک بلند برجی بنائی گئی تھی، جہاں کبھی ے توپیں نصب تھیں۔ اس قلعہ میں محکمہ آثار قدیمہ پاکستان نے ۱۹۶۸ء میں ایک عجائب گھر قائم کیا ہے، بعد میں حکومت کی طرف سے سرکٹ ہائوس بھی قائم کیا گیا۔ بعض مؤرخین اس قلعے کے بارے میں رقم طراز ہیں کہ اس قلعہ کی بنیاد کو عمر سومرو کے نام سے منسوب کیا جاتا ہے، جس نے ۱۳۵۵-۱۳۹۰ء تک یہاں حکومت کی جبکہ کچھ مورخین اسے امر کوٹ کا نام دیتے ہیں اور دلیل پیش کرتے ہیں کہ یہ قلعہ چودھویں صدی عیسوی سے بھی پہلے کا ہے، ان کے مطابق جب امر کوٹ کے راجہ سوڈھا کی بیٹی سے پدونشی راجہ مانڈم رائے کی شادی ہوئی اس وقت ۶۱۶ سمت میں راجہ مانڈم رائے کی گدی تھی جو ۵۵۹ء کا زمانہ بنتا ہے۔ بہرحال امر کوٹ اس وقت موجود تھا اس طرح عمر کوٹ صوبہ سندھ کا ایک ضلع

ہے جو حیدرآباد سے مشرق کی طرف ۱۴۰ کلومیٹر کے فاصلہ پر ہے، عمرکوٹ کا بانی عمر سومرہ دوم، سومرو قبیلے کا سردار تھا جس نے سندھ پر ۱۳۵۵-۱۳۹۰ء تک حکومت کی۔ مورخین کے مطابق عمر سومرہ کا پایہ تخت تھرڑی تعلقہ ماتلی میں تھا جو اس وقت عمرکوٹ کے نام سے جانا جاتا تھا اور یہ تعلقہ اس وقت راجہ میواڑ کے زیر کنٹرول تھا۔ عام طور پر قیاس کیا جاتا ہے کہ عمرکوٹ شہر، راجہ امر سنگھ نے ۱۱ویں صدی عیسوی میں بسایا تھا۔

مغل بادشاہ ہمایوں ۱۵۴۲ء میں راجہ بیر کی دعوت پر عمرکوٹ آیا، تاریخ معصومی کے مطابق راجہ نے اپنے درباریوں کے ساتھ ہمایوں کا استقبال کیا اور اس کی قدم بوسی کے بعد، اپنی رہائش گاہ اس کے لئے خالی کر دی۔ بادشاہ نے قلعہ کے باہر چند دن قیام کیا اور بلقیس مکانی حمیدہ بانو بیگم کو قلعہ کے اندر بھیج دیا جہاں اکبر ۱۵ اکتوبر ۱۵۴۲ء میں پیدا ہوا۔ یہ امر بھی تحقیق طلب ہے کہ اکبر قلعہ میں پیدا ہوا یا قلعہ سے ڈیڑھ کلو میٹر دور شمال کی جانب ایک چھت دار جگہ جو کہ مقامی زمیندار میر شاہ نے ۱۸۹۸ء میں بنوائی تھی۔ اکبر عمر کوٹ کے قلعہ میں ہی پیدا ہوا جیسا کہ گلبدن بیگم نے ہمایوں نامہ میں بیان کیا ہے جسے مورخین نے بھی صحیح ثابت کیا ہے۔ عمرکوٹ قلعہ زیادہ تر سوڈھو قبائل (راجپوت) کے زیر تصرف رہا۔ عمرکوٹ یا امرکوٹ کو پامار سوڈھا راجہ عمر سومرہ کے نام سے بھی پکارا جاتا ہے۔ یہ قلعہ اتنا ہی پرانا ہے جتنا کہ عمرکوٹ مگر دیکھنے میں قلعہ کے آثار بتاتے ہیں کہ یہ اتنا پرانا نہیں، بعض مورخین کے مطابق یہ قلعہ نور محمد کلہوڑا نے ۱۷۴۶ء میں بنوایا، یہ کسی طرح بھی قرین قیاس نہیں۔

بعض مورخین کی رائے ہے کہ میاں نور محمد کلہوڑانے پرانا قلعہ گرواکر یہ نیا قلعہ بنوایا اور اس کی دلیل یہ دیتے ہیں کہ اکبر کی جائے پیدائش کے مقام پر قلعہ تھا، ماہرین تاریخی آثار کو اس جگہ پر قلعہ کے کوئی نشان نہیں ملے۔ یہ قلعہ لمبائی میں ۲۹۲ میٹر، چوڑائی ۲۲۸ میٹر جب کہ اس کی بیرونی فصیل ۳ میٹر موٹی جو قدرے ترچھی اندرونی اور بیرونی طور پر ہیں۔ اس کے چاروں کونوں پر ۴ قدرے گولائی دار برج ہیں۔ ان میں سے ایک برج تو مکمل طور پر ختم ہو چکا ہے اور دوسرا ابھی گرنے والا ہے۔ ان برجوں کی سامنے کی دیواریں سورج کی تپش سے پکی ہوئی اینٹوں کی ہیں۔ اس کا داخلی دروازہ شاہی دروازہ کہلاتا ہے جو قلعہ کی مشرقی دیوار میں ہے۔ نقشہ کے مطابق یہ خفیہ راستہ ہے اوپر محراب سے یہ حصہ جو بعد کی تعمیر ہے داخلی دروازہ کے دونوں برج گھوڑے کے سموں سے مشابہ ہیں، جو رائے رتن سنگھ کے گھوڑے کے سموں سے منسوب ہے۔ روایت کے مطابق جب رائے تن سنگھ کو قلعہ میں پھانسی دی جارہی تھی تو اس کے گھوڑے نے دیوار پھلانگنے کی کوشش کی تھی۔ قلعہ کی شمال مغربی طرف سنگھ کھٹو زرد پتھر کی آٹھ ستونوں پر ایک چھت کے نیچے ایچ دی واٹسن کی قبر ہے جو یہاں تھر اور پارکر ضلع کا ڈپٹی کمشنر تھا۔ اس کی قبر پر انگریزی زبان میں تین کتبے لگائے گئے ہیں۔

عمر کوٹ کے بارے میں یہ بھی کہا جاتا ہے کہ یہاں پرماروں نے بھی حکومت کی ہے۔ اس حوالے سے ڈھاٹ کی تاریخ کا ابتدائی حصہ کھل کر سامنے نہیں آیا مگر بعض تاریخ نویسوں نے کچھ اشارے دیے ہیں کہ چھٹی صدی عیسوی میں یہاں پرمار راجپوتوں کی حکمرانی تھی، چھٹی صدی کے آخر میں پونگل کے بھائی راجہ منڈ رائو نے امر کوٹ کے پرمار راجہ سوڈہ کی بیٹی سے شادی کی تھی، دسویں صدی عیسوی کے آخر میں جوگراج پرمار امر

کوٹ کا راجہ تھا، یہ راجدھانی اسے باپ دھرنی براہ کی طرف سے مارواڑ کی تقسیم کے وقت ملی تھی۔ جیسلمیر کی تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ گیارہویں صدی عیسوی کے شروعات میں بھی امرکوٹ پر پرماروں کی حکومت تھی۔ گیارہویں صدی عیسوی کے درمیان امرکوٹ پر سومرہ خاندن کی حکومت تھی جو خود پرمار راجپوتوں کی ایک شاخ ہے۔

اس حوالے سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ بامڑ ولد دھری براہ جو آبو پہاڑ کا حاکم تھا اس کا بیٹا سوڈھو اپنے باپ بامڑ کی رہائش گاہ رادھنپور سے نکل کر ۱۱۲۵ھ میں سندھ کے سومرو حاکم کے پاس چلا آیا جس نے مہربانی کے طور پر اسے رتوکوٹ (دریائے نارا کے کنارے ڈھلیار کے نزدیک) کی حکومت سونپ دی۔ سوڈھو اور اس کا بیٹا چاچکدیو، رتوکوٹ پر ہی قناعت کئے رہے مگر چاچکدیو کے بعد جب راج دیو عرف رائے دیور توکوٹ کی گدی پر بیٹھا تو اس نے ۱۲۲۶ء میں جنیھ چارن کے ذریعے امرکوٹ پر حملہ کرکے اس پر قبضہ کرلیا۔ دھارابرش حاکم امرکوٹ سے سومرو حاکم سندھ دودو (سوم) نے حکومت چھین لی۔ اس دن سے مسلسل سومرے حاکم امرکوٹ پر حکومت کرتے چلے آئے ورنہ اس سے قبل جنوبی تھر جسے دیرک پرگنہ کہا جاتا تھا اس پر سومرو خاندان کی حکومت تھی۔ دھارابرش سے حکومت چھن جانے کے بعد اس کا بیٹا درجن شال امرکوٹ میں ہی رہا مگر چھوٹا بیٹا آس رائے نقل مکانی کرکے پارکر میں مقیم ہوگیا جہاں اس نے نگرپارکر کو نئے سرے سے ترقی دی۔ امرکوٹ اور پارکر کا علاقہ زمانہ قدیم سے ہی آباد ہے مگر وسطی تھر کبھی آباد اور کبھی غیر آباد رہا ہے۔ وسطی تھر میں لٹیرے اور چور پناہ لیتے تھے۔ راجپوتوں کے آنے کے بعد بھیل قبیلہ بھی آیا جس کے جوانوں نے ان کے لئے فوجی دستے کا کام دیا، اس قبیلہ نے وسطی تھر میں کنویں کھودے، گائوں آباد کئے اور کھیتی باڑی کرنے لگے۔

قلعے کے مرکز میں ایک وسیع برج بنا ہوا ہے۔ ایک سو دس فٹ اونچے اس برج پر پہنچنے کے لیے آپ کو ساٹھ کے قریب سیڑھیاں چڑھنی پڑتی ہیں، اور جب آپ وہاں پہنچ جاتے ہیں تو آپ اس قلعے کی ویرانی اور گرتی ہوئی فصیلوں کو اچھے طریقے سے دیکھ سکتے ہیں۔ مشرق کی طرف برٹش راج کی 'کورٹ کچہری، 'تپیدارز ہال، 'ہیڈ منشی کورٹ کی وہ ٹوٹی پھوٹی عمارتیں ہیں جہاں اُس زمانے میں نہ جانے کیسے کیسے کیس چلے ہوں گے، کیسے کیسے فیصلے آئے ہوں گے۔ کہتے ہیں کہ اس قلعے کہ اندر ایک تالاب تھا جس کو پھانسی گھاٹ کے طور پر استعمال کیا جاتا تھا۔ یہاں کے جاگیردار شہزادہ چندر سنگھ کے دادا رتن سنگھ کو انگریزوں نے پھانسی دی تھی۔ پاکستان کے قیام کے بعد اس تالاب کو بند کر دیا گیا۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ یہ برج کلہوڑا حکمرانوں نے بنوایا تھا مگر اس میں مٹی بھر کر انگریزوں نے مکمل کیا، اس برج پر ایک توپ نصب ہے۔ کہا جاتا ہے کہ یہ توپ کلہوڑا دور کی بنی ہوئی ہے۔ اس پر فارسی میں 'این توپ کارخانہ سرکار خدایار خان بہادر عباسی کاتب جنگ ۱۱۴۰' تحریر ہے، جبکہ توپ کی نالی پر دوسری جگہ 'عمل مصطفا پک کنندہ ہے۔ ان توپوں کو چلانے کے لیے مقامی طور پر تیار کردہ بارود استعمال ہوتا تھا۔

صدیوں قدیم اس پر شکوہ قلعہ کو جو کئی صدیوں تک اپنے حکم رانوں کی شان و شوکت کی عکاسی کرتا تھا، آج امتداد زمانہ کے ہاتھوں رو بہ زوال ہے۔ حکومت سندھ اور محکمہ قدیم آثار کی عدم توجہی کے باعث صدیوں پرانی تاریخی عمارت کے نقوش معدوم ہوتے جارہے ہیں۔ قلعے کی بلند و بالا فصیلیں زمیں بوس ہو رہی ہیں جبکہ اس کے اندر صدیوں پرانی تعمیرات بھی مٹی کا ڈھیر بن چکی ہیں ایک اونچا چبوترا اور توپ موجود ہے مگر وہ بھی اپنی اصل ہیئت کھوتے جارہے ہیں۔ قلعے کے اندر ایک میوزیم بھی واقع ہے جہاں

مغلیہ، سومرو، کلہوڑا اور قدیم ادوار کے بادشاہوں کے زیر استعمال ہتھیار اور جنگی سامان موجود ہے لیکن یہ بھی زنگ آلود اور خستہ حالت میں ہے

مغلیہ ادوار کی تصاویر، تحریریں، قدیم مورتیاں اور دیگر نسخے بھی زمانے کی دست برد کا شکار دکھائی دیتی ہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ حکومت اس جانب خصوصی توجہ مبذول کر کے تاریخی قلعے اور تاریخی ورثہ کو محفوظ بنانے کے لیے اقدامات کرے۔

فتح آباد قلعہ سکرنڈ:

قومیں اپنے تاریخی اثاثوں کی دیکھ بھال کرتی ہیں کیوں کہ ان کی صورت میں ان کا ماضی جھلکتا ہے۔ ہماری بد قسمتی ہے کہ ہم اپنی تاریخ و ثقافت کی نشانیوں کی حفاظت نہ کر سکے۔ سندھ حکومت کی غفلت یا لا پروائی کی وجہ سے صوبے کے زیادہ تر تاریخی آثار قصہ پارینہ بنتے جا رہے ہیں۔ اس کی ایک مثال، نواب شاہ سے بیس کلومیٹر مغرب کی جانب نیو سکرنڈ شہر میں فتح آباد کا قلعہ ہے جس کی باقیات صرف کھنڈرات کی صورت میں ہی نظر آتی ہیں، ورنہ روئے زمین سے اس کا نام و نشان مٹ چکا ہے۔ میر فتح علی خان تالپور نے ۱۷۸۴ء میں خیر پور میں میران تالپور کی حکومت کی بنیاد ڈالی اور خدا آباد کو اپنا پایہ تخت بنایا۔ وہ ایک مرتبہ نواب شاہ آئے تو آج جہاں نیو سکرنڈ شہر آباد ہے، وہاں ”شکر ڈھنڈ“ نام کی ایک خوب صورت جھیل بہتی تھی۔ جھیل کے اطراف کے سحر انگیز ماحول، حسین مناظر، فرحت بخش آب و ہوا نے انہیں بہت متاثر کیا۔ میر فتح علی خان نے جھیل کے کنارے ایک شہر بسا کر اس کی حفاظت کے لئے ایک قلعہ کی تعمیر کا بھی حکم دیا۔ اس شہر کو

ان کے نام سے منسوب کیا گیا جب کہ قلعہ کا نام بھی شہر کے نام سے جانا جاتا تھا۔ اس قلعہ کے دو دروازے تھے، ایک دروازہ شمال میں جھیل کی جانب کھلتا تھا۔ میر فتح علی خان حکومتی ذمہ داریوں سے وقت نکال کر اپنے اہل خانہ کے ساتھ اس قلعہ میں رہائش اختیار کرتے تھے۔

قلعہ کے اندر شہر کی حفاظت پر مامور سپاہیوں اور سرکاری اہل کاروں کی رہائش گاہیں تھیں۔ یہاں مسلمان اور ہندو، دونوں مذاہب کے لوگ مل جل کر رہتے تھے۔ آج بھی قلعہ کے کھنڈرات کے قریب ہندوؤں کا ایک پرانا مندر بوسیدہ حالت میں موجود ہے، جس کی ایک حصے کی دیوار گر چکی ہے۔ ہندوؤں نے قیام پاکستان کے بعد اس مندر کی جانب توجہ کم کر دی کیونکہ انہوں نے نیو سکرنڈ شہر کے مرکزی بازار میں اپنی مذہبی رسومات کی ادائیگی کے لئے ایک نیا مندر تعمیر کر لیا تھا۔

قلعہ فتح آباد کی تباہی کے جو اسباب سامنے آتے ہیں ان میں سے ایک میران تالپور کا مذکورہ قلعہ کی حفاظت اور دیکھ بھال کے لئے توجہ نہ دینا جبکہ اس کی تباہی میں ماضی میں آنے والے طوفان، سیلاب اور شدید بارشوں کے علاوہ محکمہ قدیم آثار اور حکومت کی عدم توجہی بھی شامل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج قلعہ کا نام ونشان مٹ چکا ہے اور جو بچے کھچے آثار باقی ہیں، ان سے قلعہ کے پرشکوہ ہونے کا نشان ملتا ہے۔ ماضی کا فتح آباد شہر جس کا موجودہ نام سکرنڈ ہے، ایک بلند وبالا ٹیلے پر قائم ہے۔

تیرھویں صدی ہجری کے اوائل میں تعمیر ہونے والا فتح آباد قلعہ صفحہ ہستی سے مٹ چکا ہے جب کہ اس کے قریب بہنے والی شکر ڈھنڈ جھیل بھی عدم وجود ہو چکی ہے لیکن

اس کی مناسبت سے فتح آباد شہر کو “سکرنڈ” کے نام میں تبدیل کر دیا گیا۔ تالپور خاندان جو کہ سندھ کے حکمرانوں میں ان کا شمار ہوتا تھا اور ان کا لقب میر تھا جسے حرف عام میں رئیس یا بادشاہ کے طور پر جانا جاتا تھا لیکن سندھ میں مشہور کہاوت ہے کہ (میرین کھی گھر مان لگی) یعنی تالپور خاندان کی باہمی چپقلش اور ریشہ دوانیوں کا دشمنوں نے فائدہ اٹھایا اور ان کے خلاف سازش کر کے سندھ میں تالپور خاندان کے اقتدار کا چراغ گل کر دیا۔

سندھ کے قدیم خطے میں لاتعداد تاریخی آثار بکھرے ہوئے ہیں، جو وقت کے ساتھ ساتھ مٹتے جارہے ہیں۔ حکومت اور محکمہ ثقافت اربوں روپے سالانہ آمدنی کے باوجود ان کی طرف سے لاپروائی برت رہا ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ان آثار کو محفوظ کرنے کے لیے اقدامات کیے جائیں۔

خیبر پختونخوا کے قلعے:

قلعہ بالا حصار:

صوبہ خیبر پختونخوا کے تاریخی شہر پشاور میں فنِ تعمیر کا عظیم شاہکار ’قلعہ بالا حصار‘ کئی صدیاں گزر جانے کے باوجود بھی اپنی شان و شوکت دکھا رہا ہے۔ ’بالا حصار‘ فارسی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی اونچائی پر واقع محفوظ قلعے کے ہیں۔ تاریخی طور پر پشاور شہر کی جنوبی ایشا میں ایک خاص اہمیت رہی ہے اور یہ خطے کی تمام تہذیبوں کا مرکز رہا ہے۔ یہ برصغیر کا دروازہ تھا اور ہر نئے حملہ آوروں کا پہلا پڑائو یہیں ہوتا تھا۔ یہاں موجود قلعہ بالا حصار ہمارے ملک کا ایک تاریخی ورثہ ہے، یہ غالباً اتنا ہی پرانا ہے جتنا کہ پشاور شہر۔ یہ ایک بہت بڑا قلعہ ہے، جس کا ایک ہی دروازہ ہے اور اس کا رُخ ہندوستان کے راستے کی جانب ہے۔

قلعہ کی اندرونی دیوار کی بلندی پچاس فٹ ہے۔ دوہری دیواروں والے اس قلعہ کا کل رقبہ سوا پندرہ ایکڑ پر محیط ہے جبکہ اس کا اندرونی رقبہ دس ایکڑ بنتا ہے۔ ایک پختہ سڑک بل کھاتی ہوئی قلعہ کے اندر تک جاتی ہے، قلعہ کے احاطے میں دو مزارات ہیں، ان میں سفید گنبد والا مزار حافظ مستان شاہ کا ہے جو قلعہ کی اندرونی دیوار کے جنوب مشرقی کونے میں واقع ہے۔ مزار کے قریب ہی ایک ۱۲۰ فٹ گہرا ایک پرانا کنواں بھی موجود ہے۔ دوسری زیارت قلعہ کے شمال مغربی کونے پر سید پیر شاہ بخاری کی ہے۔

پاکستان کے ماہر آثار قدیمہ ڈاکٹر احمد حسن دانی کے مطابق ۶۳۰ء میں چینی سیاح ہیون سانگ نے پشاور کا دورہ کیا اور وہاں موجود شاہی رہائش گاہ کے متعلق بات کی۔ اس کا کہنا تھا کہ بلند و بالا دیواروں والا حصہ، شاہی رہائش گاہ کا سب سے اہم اور خوبصورت مقام

تھا۔ ڈاکٹر احمد حسن دانی نے اس خطے اور قلعے کے حوالے سے لکھا کہ دریائے باڑہ کی گزر گاہ نے ایک اونچی جگہ کو گھیرا ہوا تھا، جس میں قلعہ بالا حصار اور اندر شہر واقع تھا۔ دریا کا شمالی حصہ بالا حصار کی بنیادوں کو چھوتا ہو گا۔

جب ۹۸۸ء میں غزنی کے امیر سبکتگین نے پشاور فتح کیا تو اس نے ۱۰ ہزار گھڑ سواروں کے ساتھ یہاں پڑاؤ ڈالا۔ سبکتگین اور اس کی فوج نے یقیناً اسی قلعے میں قیام کیا ہو گا۔ سلطان محمود غزنوی نے پشاور کے ہندو راجاؤں جے پال اور انند پال کو ۱۰۰۱ء سے ۱۰۰۸ء کے دوران شکست دی۔ راجاؤں کی فوجوں نے بھی قلعہ بالا حصار سے پشاور شہر کا دفاع کیا ہو گا۔ شہاب الدین غوری نے پشاور کی اہمیت کے پیش نظر ۱۱۷۹ء میں اس قلعہ پر قبضہ کیا۔

اس کے علاوہ مغل بادشاہ ظہیر الدین بابر نے بھی اپنی خود نوشت ’تزک بابری‘ میں باگرام یعنی پشاور کے قریب اپنی فوجوں کے اترنے اور شکار کے لیے روانگی اور قلعہ بالا حصار کا ذکر کیا ہے۔ افغان بادشاہ شیر شاہ سوری نے مغل بادشاہ ہمایوں کو شکست دینے کے بعد قلعہ بالا حصار کو تباہ کر دیا تھا مگر شاہ ایران کی مدد سے جب ہمایوں نے اپنا تخت دوبارہ حاصل کیا تو کابل سے واپسی پر پشاور میں قیام پذیر ہوا۔

ہمایوں نے قلعہ بالا حصار کی تعمیرِ نو کروائی اور ازبک جرنیل سکندر خان کی نگرانی میں وہاں ایک بڑا فوجی دستہ تعینات کیا۔ اس وقت قلعہ میں پہلی مرتبہ توپیں نصب کی گئیں۔ ۱۸ویں صدی میں فارس کے نادر شاہ نے درہ خیبر کے راستے ہندوستان پر حملہ کیا تو سب سے پہلے پشاور شہر کو مغلوں سے حاصل کیا اور وہاں اپنا گورنر مقرر کیا، جس کی رہائش قلعہ بالا حصار میں تھی۔

نادر شاہ کے بعد احمد شاہ ابدالی نے وہاں حکومت کی۔ اس کے فرزند تیمور شاہ ابدالی کے دور میں پشاور موسم سرما میں درانی سلطنت کا دارالحکومت ہوا کرتا تھا۔ روایت ہے کہ تیمور شاہ نے ہی اس قلعے کا نام بالا حصار رکھا، جو طویل عرصے تک درانیوں کے زیرِ استعمال رہا۔ درانی شاہان نے قلعہ میں رہائش کے لیے محلات تعمیر کروائے اور حفاظتی دستے کیلئے تاجک اور ایرانی سپاہیوں کو بھرتی کیا۔ ۱۸۳۴ء میں سکھ پشاور پر قابض ہوئے تو انھوں نے قلعہ کی اینٹ سے اینٹ بجادی۔ بعد میں ہری سنگھ نلوہ اور سردار کھڑک سنگھ نے قلعہ بالا حصار کی اہمیت کے پیشِ نظر اس کی تعمیرِ نو کروائی۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ کے حکم پر شیر سنگھ نے کچی اینٹوں سے قلعہ بنوایا اور اس کا نام تبدیل کر کے سمیر گڑھ رکھ دیا گیا مگر مقامی سطح پر یہ نام مشہور نہ ہو سکا۔ قلعہ بالا حصار کی مرکزی دیوار پر سکھوں کے دور کی تختی آج بھی نصب ہے۔

سن ۱۸۴۹ء میں جب انگریزوں نے پنجاب اور خیبر پختونخوا پر قبضہ کیا تو قلعہ بالا حصار کی دیواریں کچی اینٹوں اور گارے سے تعمیر شدہ تھیں، جنہیں ڈھا کر انگریزوں نے پختہ اینٹوں سے دیواریں تعمیر کروائیں جو کہ تاحال قائم ہیں۔ ساتھ ہی فوجیوں کے لیے قلعے کے اندر بیرکیں بنوائیں۔ قیامِ پاکستان کے وقت انگریز سامراج کی فوج کا ایک دستہ قلعہ بالا حصار میں قیام پذیر تھا، تاہم، ۱۹۴۸ء سے قلعہ بالا حصار فرنٹیئر کانسٹبلری کے ہیڈ کوارٹر کے طور پر استعمال کیا جارہا ہے۔ ۲۰۱۵ء میں آنے والے ہندوکش زلزلہ میں جزوی طور پر قلعے کی ایک دیوار متاثر ہوئی تھی، جسے دوبارہ تعمیر کر دیا گیا۔ شیر شاہ سوری کی تعمیر کردہ جرنیلی سڑک کے کنارے موجود اس تاریخی قلعے کو بحالی اور تزئین و آرائش کے بعد سیاحتی مقام بنانے کا منصوبہ ہے۔

قلعہ چترال:

پاکستان کے شمال مغرب میں ضلع چترال سلسلہ ہندوکش میں واقع ایک دلکش وادی ہے۔ تقریبا چار لاکھ آبادی کا یہ شہر اپنے دلکش مناظر اور خوشگوار موسم کے لئے سیاحوں میں کافی مقبول ہے۔ لیکن اس شہر کی وجہ شہرت صرف یہی نہیں بلکہ یہاں چند قدیمی عمارتیں بھی دیکھنے کے لائق ہیں۔ ان میں شہر کے وسط میں واقع پرانا شاہی قلعہ اور شاہی مسجد شامل ہیں۔

شاہی قلعہ کی زبوں حالی کا اندازہ تو اس کے عالیشان صدر دروازے پر پہنچ کر ہی ہو جاتا ہے۔ انسانی عدم توجہ اور قدرتی زلزلوں کے اثرات چیخ چیخ کر اپنی جانب توجہ دلاتے ہیں۔ ستونوں کا پلاسٹر جھڑ رہا ہے جبکہ کئی مینار غائب ہیں۔

ایک چھوٹے سے دروازے سے قلعے کے اندر داخل ہوں تو ایک اور ویرانہ آپ کو حیران کر دے گا۔ بڑے سے میدان کے ارد گرد بغیر چھت کے کمرے عجیب وحشت کا سما پیدا کرتے ہیں۔ انہیں میں سے ایک کمرے میں کبھی مقامی کھوار زبان کی ترویج اور فروغ کا کوئی دفتر تھا۔ دفتر اور عہدیدار تو موجود نہ تھے لیکن ایک پرانا زنگ آلود بورڈ ابھی بھی لٹکا ہوا نظر آتا ہے۔

اس قلعے کی تعمیر مقامی لوگوں نے اس وقت کے مقامی طرز تعمیر کے مطابق اور مقامی طور پر مہیا وسائل سے کی تھی۔ ماہرین کا کہنا ہے کہ اس میں کسی حملہ آور یا بیرونی طرز تعمیر کا کوئی اثر نہیں۔ چترال کے دانشور ڈاکٹر عنایت اللہ فیضی کہتے ہیں کہ قلعہ کا قدیم حصہ خالص مقامی طرز تعمیر کا آئینہ دار ہے۔ البتہ انیسو چھبیس کو اس قلعے کے بیرونی حصے، دربار ہال اور دفاتر کی عمارت کی نئی تعمیر شروع ہوئی جو سولہ برسوں میں مکمل ہوئی۔ ڈاکٹر عنایت کے مطابق اس طرح یہ قلعہ قدیم اور اس وقت کے جدید مغل طرزِ تعمیر کا ایک حسین امتزاج بن گیا۔ لیکن قلعے کے بعض حصے آج بھی قدرے بہتر حالت میں موجود ہیں۔ یہاں چترال کے حکمراں یا مہتر رہا کرتے تھے۔ اس میں شاہی مہمان خانہ قابل ذکر ہے۔ قدیم قندیلیں اور کاشی کاری سے مزئین در و دیوار ایک پر مسرت احساس دلاتے ہیں۔ یہاں بھی آپ کو پشاور کے قدیم محلہ سیٹھیان کی حویلیوں جیسا آرائشی کام دیکھنے کو ملے گا۔

دوسری چھت پر بڑے کمرہِ خاص کو چترال کے مہتروں یا حکمرانوں کی بڑی بڑی تصاویر سے بھی سجایا گیا ہے۔ ان میں موجودہ حکمراں سیف الملوک ناصر کی بچپن کی تصویر بھی تھی۔ جبکہ باہر ماضی کی زنگ آلود توپیں بھی پڑی دھول اکٹھی کرتی ملیں گی۔ اس محل کے سامنے زمین میں ایک دروازہ دیکھا تو پوچھا یہ کیا ہے بتایا گیا زیر زمین قید خانہ۔ کافی خوفناک نظر آتا تھا۔ قلعہ کی دو سمت میں کافی بڑے بڑے سرسبز باغات موجود ہیں اور ایک ہوٹل بھی کام کر رہا ہے۔

اس خطے میں قلعے ویسے نہیں ہوتے جیسا قلعہ لاہور ہے، پر ہیبت اور پر وقار بل کہ یہ ایک مستطیل یا چوکور احاطہ ہوتا ہے جس کی دیواریں مٹی پتھر اور چوبی شہتیروں سے اٹھائی جاتی ہیں اور بہت زیادہ بلند بھی نہیں ہوتیں۔ چاروں کونوں پر نگہبانی کے چورس برج ہوتے ہیں اور اندر عام رہائشی تعمیرات چترال صدیوں سے یورپی اور ایشیائی حکمرانوں کی راہ گزر رہا ہے۔ کیوں کہ یہ چین اور شمالی مغربی ہندوستان کے درمیان شارٹ کٹ تھا۔ اس لیے بے حد اہم راستہ تھا۔ چنانچہ پہلے یہاں بدھ آئے پھر اسماعیلی آئے، ان کے بعد عرب آئے۔ برصغیر پر انگریز قابض ہوئے تو چترال بھی ان کے زیر نگیں رہا۔ مارکوپولو خود تو چترال نہیں آیا لیکن اپنے چین کے سفر نامے میں اس کا ذکر ضرور کرتا ہے۔ اب ایسی اہم جگہ پر قلعے تو ہوں گے ہی۔ لیکن چترال کے قلعے کا داخلی دروازہ چھوڑ کر، جو اب بھی، اپنی تمام تر خستہ حالی اور بدحالی کے باوجود، خوش نما ہے۔ باقی قلعہ مضحکہ خیز حد تک ازکار رفتہ اور غیر دل چسپ ہے۔ مرے پہ سو درے اب مقامی پولیس اسے اپنے تصرف میں لیے ہوئے ہے اور سیاح کو مرکزی پھاٹک پر ”رہائشی عمارت۔ داخلہ بند ہے۔“ کی تختی ٹنگی ملتی ہے۔ اور اگر کوئی پھر بھی اندر جانے کی کوشش کرے تو اسے سختی سے روک دیا جاتا ہے۔

قلعے کے برج تقریباً ۱۵ میٹر بلند جبکہ مینار ۲۱ میٹر اونچا بنایا گیا تھا۔ ٹاور کے بالائی خانے میں داخلے کے لیے لمبی بیرونی سیڑھی تھی جو محاصرے کے دوران صرف اندھیرے میں ہی استعمال ہو سکتی تھی۔ پانی کا مینار، جو دریا کے اُس پار سے دیکھا جا سکتا ہے وہ بھی بعد میں تعمیر کیا گیا تھا۔ برآمدے زمین سے اونچے بنائے گئے تھے، جن کی بالائی منزل پر رہائشی کمرے تھے۔ قلعے کا عقبی دروازہ ایک شکستہ بالکنی پر کھلتا ہے، جس کی ریلنگ اب موجود نہیں ہے۔ اس کے شمال مشرقی برج میں داخل ہوں تو کھلی اور کم اونچائی والی سیڑھیاں بل کھاتی ہوئی اوپر لے جاتی ہیں۔ اوپر ایک چوکور کمرہ ہے، جس کی چھت جگہ جگہ سے اور فرش کہیں کہیں سے ٹوٹا ہوا ہے۔ اس کمرے کے چاروں طرف لکڑی کا برآمدہ ہے۔ قلعے کی کئی دیواریں، چھتیں، تہ خانے، کھڑکیاں، دروازے شکستہ حال اور اجاڑ ہیں۔ قلعے کے بعض حصے آج بھی قدرے بہتر حالت میں موجود ہیں، جس میں شاہی مہمان خانہ قابل ذکر ہے۔ یہاں قدیم قندیلیں اور کاشی کاری سے مزئین دَر و دیوار کے علاوہ پشاور کے قدیم محلہ سیٹھیان کی حویلیوں جیسا آرائشی کام دیکھنے کو ملتا ہے۔ چھت پر موجود بڑے کمرہ خاص کو چترال کے مہتروں (حکمرانوں) کی تصاویر سے سجایا گیا ہے۔ قلعے کے باہر ماضی کی زنگ آلود توپیں بھی موجود ہیں۔ تاہم، یہ قلعہ اس وقت کے جدید مغل طرزِ تعمیر کا ایک حسین امتزاج معلوم ہوتا ہے۔ قلعہ کی دو جانب بڑے بڑے سرسبز باغات موجود ہیں۔

قلعہ دروش:

اسے مقامی زبان کھوار میں شاہی قلعہ اور دروشپو قلعہ بھی کہا جاتا ہے۔ یہ ضلع چترال کے گرم چشمہ میں ایک پہاڑ پر تعمیر کیا گیا۔ یہ اس علاقے کا ایک مضبوط قلعہ تھا، جس کے چھ برج تھے۔ کہا جاتا ہے کہ پرانے قلعے سے ۲۰۰ میٹر کے فاصلے پر دروش میں ایک نیا قلعہ تعمیر کیا گیا تھا۔ ۱۸۹۵ء میں پرانے قلعے کو انگریزوں نے چترال میں اپنی فورسز کے لیے تیار کیا، جس کے لیے انھوں نے نیا قلعہ گرا دیا تھا اور اس کی لکڑی کو پرانے قلعے میں استعمال کیا۔ قلعے کے لیے دریا سے گزرنے کا ایک نیا راستہ بنایا گیا تھا۔

قلعہ مستوج:

یہ قلعہ چترال کی تحصیل مستوج میں ۱۸ویں صدی میں تعمیر کیا گیا۔ یہ قلعہ شندور پاس کے قریب دریائے یارخون اور دریائے مستوج کے سنگم پر ایک سطح مرتفع پر واقع ہے۔ خیال کیا جاتا ہے کہ یہ قلعہ کٹور خاندان نے ۱۷۸۰ء میں تعمیر کروایا تھا جبکہ

۱۸۳۰ء میں اس کے کچھ حصوں کی از سر نو تعمیر کی گئی۔ تاہم ۱۹۲۰ء کی دہائی میں اس کی ایک بار پھر تعمیر نو کی گئی۔

قلعہ تین حصوں میں تقسیم تھا، ایک میں انگریز افسروں کی رہائش گاہیں اور بیرکیں تھیں، دوسرا حصہ باغ پر مشتمل تھا جبکہ تیسرے حصے میں شہزادے (مہترِ چترال کا بیٹا) کی رہائش تھی۔ اس کے علاوہ اس میں جیل، مسجد اور دفاتر بھی تھے۔ ۱۸۹۵ء کے دوران اس علاقے میں ہونے والی محاذآرائی میں یہ قلعہ جندولی اور انگریز رجمنٹ کے درمیان محاذ آرائی کا گڑھ رہا۔ اب اس کے اندر ایک ہوٹل بنا ہوا ہے۔

قلعہ چکدرہ:

پاکستان کا صوبہ خیبر پختونخوا جغرافیائی طور پر وہ خطہ ہے جو جنوبی ایشیا کو وسطی ایشیا سے ملاتا ہے۔ گزشتہ ادوار میں یہ پہلے وسطی ایشیا سے برصغیر میں داخلے کا واحد راستہ بھی تھا، جس کے باعث یہ تاریخی طور پر اسٹریٹیجک لحاظ سے انتہائی اہمیت کا حامل رہا ہے۔ افغان، فارسی، یونانی، کُشن، ہُنز، منگول، مغل اور دیگر بیرون ملک حملہ آوروں کو جب بھی برصغیر پر قبضہ کرنا ہوتا تھا تو وہ یہاں سے برصغیر میں داخل ہوا کرتے تھے۔

برطانوی سامراج کو بھی یہاں سخت مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ صوبہ خیبر پختونخوا کی مختلف ایجنسیوں، شمالی وزیرستان اور جنوبی وزیرستان وغیرہ میں اپنی رِٹ قائم کرنے کے لیے انگریزوں نے یہاں کئی چھوٹے اور درمیانی درجے کے قلعے تعمیر کیے۔

چکدرہ قلعہ کی تعمیر ۱۸۹۵ء میں ایک چٹان پر کی گئی۔ اس کے ایک طرف میدان اور دوسری جانب پہاڑ ہیں۔ قلعہ کو دفاعی نقطہ نظر سے تعمیر نہیں کیا گیا تھا، جس کی وجہ سے یہ

دفاعی اعتبار سے کمزور تھا۔ تاہم، قدرتی چٹانیں اس کا دفاع کرتی تھیں مگر دم کوٹ پہاڑی پر واقع پیکٹ سے قلعہ پر حملہ کیا جاسکتا تھا۔ قلعے پر باہر سے گولہ باری کرنا بھی آسان تھا۔ یہاں سے ادینزئی، بٹ خیلہ، تھانہ اور سوات کے کچھ علاقوں کو بآسانی دیکھا جاسکتا ہے۔ قلعہ چکدرہ اس وقت پاکستان اسکاؤٹ اور آرمی کے زیرِ استعمال ہے۔

ہینڈی سائیڈ فورٹ کوہاٹ:

یہ قلعہ خیبر پختونخوا کے شہر کوہاٹ میں خیبر پاس کے جنوب میں واقع ہے۔ ۱۸۵۳ء میں انگریزوں نے اس قلعے کی تعمیر کی تھی تا کہ کوہاٹ پاس کے اردگرد فوجی کارروائی کے لیے ایک مضبوط اڈہ فراہم کیا جاسکے۔ قلعے میں ایک سرنگ بنائی گئی اور اس کے آس پاس خندق کھودی گئی تھی۔

اس قلعے کا نام فرنٹیئر کانسٹیبلری جنگجو ایرک چارلس ہینڈ سائڈ کے نام پر رکھا گیا۔ خیال کیا جاتا ہے کہ یہ قلعہ پہاڑ کی اس چوٹی پر بنایا گیا تھا جہاں سکندر اعظم نے شمال کی طرف مارچ

کرنے سے پہلے اپنی فوج کے ساتھ ڈیرے ڈالے تھے۔ یہ قلعہ اب پاک فوج کے نویں ڈویژن کے صدر مقام کے طور پر استعمال ہوتا ہے۔

قلعہ جمرود:

پاکستان کے قدیم مقامات میں سے ایک تاریخی جمرود قلعہ سیاحوں کے لیے یہ ایک اہم جگہ ہے۔ سکھ فوج کے لیے جمرود کئی لحاظ سے اہم تھا کیونکہ یہاں سے افغانستان سے آنے والے حملہ آوروں کا راستہ روکا جاسکتا تھا اور یہیں سے افغانستان پر آسانی سے حملے کیے جاسکتے تھے۔ جمرود قلعہ کی تعمیر ۱۸۳۶ء سکھ جرنل ہری سنگھ نلوہ نے محض ۵۴ دنوں میں چھ ہزار فوجیوں کے ذریعے کروائی تھی۔ اس کا نقشہ قلعہ بالا حصار سے مماثلت رکھتا ہے کیونکہ اس کی مرکزی عمارت کے اطراف بھی حفاظتی دیوار تعمیر کی گئی ہے۔

قلعہ کی دیواروں کی چوڑائی ۱۰ فٹ جبکہ اونچائی ۳۰ فٹ کے قریب ہے اور ان کی تعمیر میں مٹی اور پتھر کا استعمال کیا گیا۔ ارد گرد کے علاقے پر نظر رکھنے کے لیے ۱۲ فٹ بلند برج تعمیر کیے گئے اور ان پر توپیں رکھی گئیں اور ان میں ایسے راستے بنائے گئے جن پر سامان سے لدے ہوئے خچر بآسانی برج تک پہنچ سکیں۔

دو منزلہ جمرود قلعے کی تعمیر اونچے مقام پر کی گئی تاکہ وہاں سے مشرق کی جانب درہ خیبر، شمال میں مہمند اور جنوب میں باڑہ تک کے علاقے نظر آتے رہیں۔ قلعے میں پانی کی ضروریات پوری کرنے کے لیے ۴۰۰ میٹر گہرا کنواں کھودا گیا جو آج بھی موجود ہے۔ اس کے ساتھ ایک زیرِ زمین تالاب بھی بنوایا گیا، جسے بعد میں انگریز سامراج کے دور میں قید خانے کے طور پر استعمال کیا گیا۔ قلعے کی نگرانی اور انتظام خیبر رائفلز کے پاس ہے۔

قلعہ شاہ گئی:

خیبر ایجنسی میں جمرود سے ۱۳ کلو میٹر کے فاصلے پر ۱۹۲۷ء میں شگئی قلعہ تعمیر کیا گیا۔ برطانوی افواج نے خیبر پاس کی نگرانی کے لیے اس قلعے کی تعمیر کروائی تھی۔ برطانوی دورِ حکومت میں عام حیثیت سے مشہور یہ قلعہ سطح سمندر سے ۸۴۷ میٹر بلند ہے۔

تاریخی درے کے درمیان تعمیر کیے گئے اس قلعے کو بھی آثارِ قدیمہ کے مقامات میں کافی اہمیت حاصل ہے۔ یہ قلعہ پاکستان آرمی اور خیبر رائفلز کے زیرِ انتظام اور خیبر رائفلز کا ہیڈ کوارٹر رہا ہے۔ پاک فوج، افغان فوج اور نیٹو فورسز کے درمیان اسی مقام پر فلیگ میٹنگز منعقد ہوتی رہی ہیں۔

قلعہ میران شاہ:

میرانشاہ، صوبہ خیبر پختونخوا میں شمالی وزیرستان کی ایک تحصیل ہے، جو اس خطے کا صدر مقام ہے۔ یہاں برطانوی سامراج کا تعمیر کردہ قلعہ موجود ہے۔ انگریزوں نے یہ قلعہ ۱۹۰۵ء میں بنایا تھا، تاکہ شمالی وزیرستان کو کنٹرول کیا جاسکے۔ ۱۹۴۷ء میں پاکستان کی آزادی کے بعد سے یہ پاکستان فرنٹیئر کور کے 'توچی اسکاؤٹس' کے گیریژن کے طور پر استعمال ہو رہا ہے۔

علی مسجد قلعہ:

علی مسجد قلعہ خیبر پاس میں ایک اونچی جگہ پر علی مسجد کے ساتھ واقع ہے۔ کہا جاتا ہے کہ یہ قلعہ ۱۸۳۷ء میں افغان حکمران دوست محمد خان بارکزئی نے تعمیر کروایا تھا۔ قلعہ خیبر پاس کے تنگ ترین نقطہ پر واقع ہے، جہاں اس کی چوڑائی صرف چند میٹر رہ جاتی

ہے۔ ۱۹ ویں صدی کے دوران یہ قلعہ افغان اور برطانوی افواج کے مابین مختلف تنازعات کا ایک مقام بھی رہا ہے۔

قلعہ ہر کشن گڑھ ہری پور:

ہری سنگھ نلوا نے ہری پور شہر کی بنیاد سنہ ۱۸۲۳ میں رکھی تھی۔ انھوں نے سب سے پہلے یہاں پر ایک قلعہ ہر کشن گڑھ تعمیر کیا۔ یہ قلعہ دفاعی نقطہ نظر سے تعمیر کیا گیا تھا۔ ہری سنگھ نلوا نے ہزارہ ڈویژن میں اسی علاقے کو اپنا صدر مقام بھی بنایا تھا۔

سکھ جرنیل ہری سنگھ نلوا نے اسی قلعے سے ہری پور شہر کی بنیاد رکھی۔ اس شہر کو بہترین نقشے پر بنایا گیا تھا۔ یہ شہر بھی قلعہ بند تھا۔ اس میں چھ دروازے تھے۔ جس میں شیر انوالہ گیٹ آج بھی اسی نام سے مشہور ہے۔ قلعے کے ارد گرد خندق بنائی گئی تھی۔ شہر کے لیے بہترین نہری نظام بنایا گیا تھا۔

ہری پور کا قلعہ اب بھی موجود ہے۔ اس کے ایک حصے میں پولیس سٹیشن اور دوسرے حصے میں تحصیل کچہری کا دفتر ہے۔

اکال گڑھ قلعہ ڈیرہ اسماعیل خان:

سن ۱۸۳۶ میں ڈیرہ اسماعیل خان میں قلعہ اکال گڑھ جیسے بڑے تعمیراتی منصوبے میں استعمال ہونے والی پختہ اینٹوں کے لیئے اماماں والے دروازے کے ساتھ صدر بازار کے آغاز میں اینٹوں کے بھٹے کو سردار نونہال سنگھ نے اپنے خاص کاریگروں کے زریعے کچی اینٹوں کی بجائے سب سے پہلے پختہ اینٹوں والے بھٹے میں تبدیل کر دیا۔ پختہ اینٹیں بنانے کے لیئے دریا سے خاص چیکنڑی مٹی لائی جاتی۔ سیم سے بچاؤ کے لیئے مٹی میں تیل اور سینڑی کے ریشے ملا کر پھر پختہ گوگڑا اینٹیں تیار کی جاتیں۔ اماماں والے دروازے

کے نزدیکی بھٹے کی سپلائی کی ہوئی پختہ گو گڑا اینٹوں سے قلعہ اکال گڑھ کی تعمیر ہوئی۔ سردار نونہال سنگھ نے قلعہ اکال گڑھ کی تعمیر میں چونے کے استعمال کے لیئے اسی اماماں والے میدان کے اندر کئی ایک چونے کی بھٹیاں قائم کیں، جہاں سے چونا تعمیراتی مقاصد کے لیے قلعہ اکال گڑھ کو سپلائی ہوتا تھا۔ بھٹوں اور چونا بنانے کے کام کے لیئے ماہر کاریگر سردار نونہال سنگھ خصوصی طور پر پنجاب سے لایا تھا، جنہوں نے وقت کے ساتھ ساتھ موجودہ بنوں اڈے کے ساتھ والے کچی اینٹوں کے بھٹوں کو بھی پختہ اینٹوں کے بھٹوں میں تبدیل کیااور مقامی لوگوں کو بھی یہ فن سکھایا۔

سردار نونہال سنگھ نے باقاعدہ قلعہ تعمیر ہونے کے بعد یہاں موجود چونے کی بھٹیوں کے نگرانوں کو چونے کی بھٹیوں کے ساتھ ساتھ بنوں اڈے والے اینٹوں کے بھٹوں کے مسلمان نگرانوں کو مالکانہ حقوق دان کرنے کا باقاعدہ سرکاری خط تحریر کیا۔ لیکن لکھی مل نے بنوں اڈے والے تین بھٹوں کے مسلمان نگرانوں کی بجائے ان بھٹوں سے کسی قسم کا بھی تعلق نہ رکھنے والے ہندوٴ تاجروں کے نام کر دیا۔ صرف ایک اماماں والے دروازے والے بھٹے کے نگران "اللہ بخش درکھان" کو بزریعہ تحریر یہ مکمل بھٹہ دان کر دیا ۔ سردار نونہال سنگھ کے حکم سے خالصہ گوردوارہ (موجودہ ہائی سکول نمبر ۳) کی تعمیر میں بھی اسی بھٹے کی بنی ہوئی پختہ اینٹیں استعمال کی گئیں تھیں۔ وقت کے ساتھ ساتھ یہ وسیع و عریض بھٹہ سکڑتا گیا۔ ۱۸۶۰ میں ایک پگڈنڈی نمارا ستے کو باقاعدہ صدر بازار کی سڑک میں تقسیم کرنے کی وجہ سے یہ صرف ایک کونے تک محدود ہو گیا۔ ۱۹۰۶-۷ میں شہر کی مشہور قدیمی مسجد لاٹو فقیر کی دوبارا پختہ تعمیر میں بھی استعمال ہونے والی اینٹیں اسی اللہ بخش درکھان والے بھٹے سے سپلائی کی گئیں۔ ۱۹۱۰ کے آس پاس اس بھٹے کے مالک اللہ بخش درکھان کے پوتے "حسین بخش المعروف حسو درکھان" نے اسی بھٹے کے احاطے میں

کشتیوں کا ایک کھاڑا قائم کیا۔ علاقے میں واحد اکھاڑا ہونے کی وجہ سے ارد گرد کے مقامی پہلوان اور کثیر تعداد میں نوجوان یہاں کثرت کرنے آتے تھے۔ درجنوں دفعہ دوسرے شہروں کے نامور پہلوانوں کے درمیان اس اکھاڑے میں بڑے بڑے دنگل منعقد کئے گئے تھے۔ ۱۹۱۲-۱۳ میں ڈیرہ اسماعیل خان کا سب سے پہلا پختہ اینٹوں کا بھٹہ جس کی بنی ہوئی اینٹوں سے قلعہ اکال گڑھ، خالصہ سکول گردوارہ اور جامع مسجد لاٹو فقیر تعمیر ہوئی وہ مکمل طور پر ختم ہو کر اکھاڑے میں تبدیل ہوتا ہوا وقت کے ساتھ ساتھ اب مارکیٹوں، دکانوں اور گھروں میں کہیں گم ہو گیا

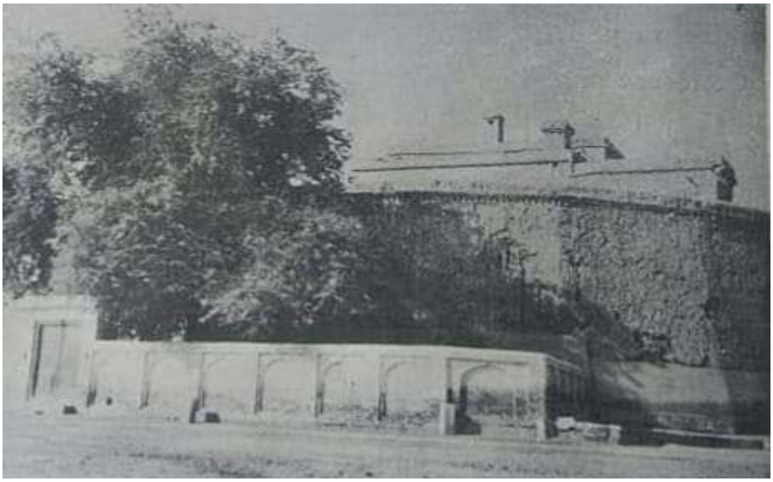

تھل قلعہ:

خیبر پختونخوا میں ضلع ہنگو کی تحصیل تھل میں انگریزوں نے ۱۹۰۹ء میں ایک چھوٹا قلعہ تعمیر کیا تھا۔ اب یہ قلعہ ایف سی کے نیم فوجی دستے تھل اسکاؤٹس کے ہیڈ کوارٹر کے طور پر کام کرتا ہے۔

بلوچستان کے قلعے:

قلعہ ژوب:

تخت سلیمان اور ژوب دریا کے درمیان واقع شہر ژوب کی سب سے اہم اور تاریخی عمارت فورٹ سینڈیمن یا سینڈیمن کا قلعہ ہے۔

یہ قلعہ گورنر جنرل بلوچستان سر رابرٹ سینڈیمن نے اپنی رہائش گاہ کے طور پر سن اٹھارہ سو نوے میں تعمیر کرایا تھا۔ اور یہ شہر انیس سو پچھتر تک اسی کے نام سے جانا جاتا تھا۔ انیس سو پچھتر میں سابق وزیر اعظم ذوالفقار علی بھٹو نے مقامی عمائدین کے مشورے سے اس شہر کا نام بدل کر ژوب رکھ دیا۔

پشتو زبان میں ژوب کا مطلب ہے 'رستا ہوا پانی' جو شاید یہاں ہر طرف بہنے والے پہاڑی چشموں کی جانب اشارہ ہے۔ انگریزوں کے زمانے میں یہ عمارت علاقے کے پولیٹیکل ایجنٹ کی رہائش گاہ ہوتی تھی۔ آج کل یہ علاقے کے ضلعی رابطہ افسر یا ڈی سی او کا گھر اور دفتر ہے۔

فورٹ سینڈیمن کی خصوصیت یہ ہے کہ یہ اس کی شکل بحری جہاز جیسی ہے۔ دور سے دیکھنے پر یوں لگتا ہے جیسے پہاڑی پر بحری جہاز کھڑا ہو۔ یہ قلعہ آس پاس کی آبادی سے کچھ فاصلے پر اور بلندی پر ہے۔ اس سے ژوب کا تقریباً پورا علاقہ نظر آتا ہے۔ مقامی لوگوں کا کہنا ہے کہ انگریزوں نے یہ قلعہ اتنا اوپر اس لیے بنایا کہ جو شخص شکایت لے کر آئے وہ یہاں تک پہنچتے پہنچتے اتنا تھک جائے کہ اس کی سانس پھول جائے اور اس کا غصہ اتر جائے۔ کچھ کا کہنا ہے کہ دراصل یہ قلعہ اس لیے بلندی پر بنایا گیا تھا کہ انگریز افسر آپ پاس

کی آبادی پر نظر رکھ سکے اور اگر کوئی بھی قلعے پر حملہ کرنا چاہے تو اسے پہلے سے پتہ چل جائے۔

قلعے کی صرف عمارت ہی پرانی نہیں، اس کے اندر بھی بہت سی تاریخی چیزیں ہیں۔ مین دروازے سے اندر داخل ہوں تو دائیں ہاتھ پر مہمان خانہ ہے۔ اس مہمان خانے کے ایک کونے میں انگریزوں کے زمانے میں ایک خفیہ سرنگ تھی جسے بعد میں بند کر دیا گیا، صوفے کے پیچھے دیوار پر لگا قالین دوڈھائی سو سال پرانا ہے اور چھت پر لگا پنکھا انیس سو دو میں انگریز اپنے ساتھ لائے تھے۔ پیلے رنگ کا دو پروں کا یہ پنکھا نوے انچ چوڑا ہے۔ قلعے میں زیادہ تر فرنیچر، پلنگ وغیرہ انگریزوں کے زمانے کے ہیں۔ ایک پیانو بھی ہے جو لارڈ سینڈیمن اپنے ساتھ لائے تھے۔ قلعے کا ایک کمرہ ایسا بھی ہے جس میں لارڈ ماؤنٹ بیٹن، محمد علی جناح، علامہ اقبال، فاطمہ جناح وغیرہ جیسی تاریخی شخصیات کے علاوہ بھی ملک کے اکثر سربراہان اور سابق وزراء اعظم ٹھہرے ہیں۔

ڈی سی او کے دفتر میں ایک لکڑی کے بورڈ پر اٹھارہ سو دس سے آج تک اس قلعے میں تعینات تمام افسران کی لسٹ آویزاں ہے۔ دوسری دیوار پر انگریزوں کے زمانے کا ایک علاقے کا نقشہ لٹکا ہوا ہے جس پر اسکی عمر کے آثار نمودار ہونا شروع ہو گئے ہیں۔ اسی قلعے کے ایک کمرے میں ایک مقامی قبائلی نے ایک انگریز افسر کو گولی مار کر ہلاک کر دیا تھا۔ بعد میں اسے پھانسی دے دی گئی۔ اونچائی پر ہونے کے باوجود اس قلعے میں پانی کا کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ انگریزوں کے زمانے ہی سے ایک قریبی چشمے کا پانی پائپ کے ذریعے قلعے کے ایک ٹینک میں جمع کیا جاتا ہے۔ چشمے کا پریشر اتنا ہے کہ بغیر بجلی کے یہ پانی باآسانی اوپر

تک پہنچ جاتا ہے۔ اکثر پرانی عمارتوں کی طرح اس قلعے کے بارے میں بھی بھوت پریت کی کہانیاں مشہور ہیں۔

کئی شخص کہتے ہیں یہاں کبھی کبھی پیانو اپنے آپ بجنا شروع ہو جاتے ہیں۔ اگرچہ یہ قلعہ ابھی تک رہائش کے کام آتا ہے لیکن اس کی عمارت میں اب جگہ جگہ ٹوٹ پھوٹ کے آثار نمایاں ہیں اور اس کی کئی چھتوں اور دیواروں کی مرمت ہو چکی ہے جبکہ اکثر کو مرمت کی ضرورت ہے۔

قلعہ میری قلات:

قیام پاکستان کے بعد بھی بلوچستان ایک آزاد ریاست کی حیثیت سے موجود رہا، جس کا دارالحکومت قلات تھا۔ بعد میں یہ ریاست بھی پاکستان میں ضم کر دی گئی۔

جب انگریز کوئٹہ پر قابض ہوئے تو خان قلات جو اس وقت ایک وسیع ریاست کا مالک تھا۔ اس نے قلات میں ایک انوکھے ڈیزائن پر ”قلعہ میری“ تعمیر کرایا۔ آج بھی یہ قلعہ علیحدگی اور حرمت کے تصور کے پیش نظر استحکام اور تکمیلات کی روشنی رکھتا ہے۔ قلعہ میری کی آب و تاب اس کے نئے ڈیزائن میں ہے۔ اسے جس کسی نے بھی تعمیر کروایا اس نے خان قلات سے ہدایات حاصل کیں اور بلوچستان میں نئے مظہر کی شکل میں اسے دیکھا اور اسے جدید رجحان کی مثال بنایا۔ شاید خان قلات کے ذہن میں جدیدیت کا کوئی ہیولہ موجود ہو اس لیے انہوں نے انسانی غیظ و غضب کی بجائے ایک نئے انداز سے قلات پر حکمرانی کی ابتداء کی تھی۔ والیائی ریاست تحفظ کے احساس کے تحت اپنی ہیبت کے لیے گرانڈیل قلعے تعمیر کراتے ہیں مگر خان قلات نے ایک وسیع قطعہ اراضی پر سبز گھاس لگا کر نیلے سمندر کا خاکہ بنایا۔ اس کے ساحل پر سمندری جہاز کو لنگر انداز دکھا کر نہ جانے کون سے تصور کو اجاگر کرنے کی کوشش کی تھی۔ قلعہ میری کی تعمیر سمندری جہاز کی شکل میں کی گئی ہے۔ قلعہ کے سامنے ایک وسیع سرسبز میدان ہے اس کے دامن میں چھوٹی چھوٹی پہاڑیاں اور جنوب کی طرف وسیع جنگل ہے۔ اس جنگل کے دامن میں قلات بازار کا تجارتی مرکز ہے قلعہ کے جنوبی سطح پر ملحق ایک چھوٹی سی مسجد ہے اور قرآن خوانی کے لیے لمبے لمبے لکڑی کے تختے ہیں۔ انگریزی تسلط کے عہد میں آخری خان قلات کے چچا اس کا والی تھا

اس زمانے میں انگریزوں کی طرف سے پولیٹیکل ایجنٹ اور دیوان مقرر کیے جاتے تھے۔ ان دیوان حضرات میں ایک صاحب اقتدار نے ایسی اندھیر گردی مچائی کہ آج تک اس کی بازگشت سنائی دیتی ہے

پنھوں فورٹ:

میری قلات کیچ کے شمال مغرب کی طرف تربت سے تقریباً ۱۰ سے ۱۲ کلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہے۔ یہ ایک قدیم اور تاریخی مقام ہے۔ ایک اونچے ٹیلے پر بنے ہوئے بڑے قلعے کے آثار اور باقیات کھنڈر کی شکل میں نظر آتے ہیں۔ عدم توجہ کے باعث وقت گزرنے کے ساتھ مقامی طور پر 'میری قلات' اور 'پنوں قلات' کے نام سے جانے جائے والے اس تاریخی اور قدیم قلعے کے آثار اور باقیات کھنڈر کی شکل میں رہ گئی ہیں۔

قلعے کی دیواروں اور برجوں کی باقیات دیکھی جاسکتی ہیں۔ ایک اونچے ٹیلے پر واقع ہونے کی وجہ سے اس قلعے کی پرانی دیواریں چھپی ہوئی ہیں۔ غالب امکان یہ ہے کہ ۱۰ میٹر اونچائی تک عمارتیں ہزاروں سال پہلے رہائش گاہ کے طور پر استعمال ہوتی تھیں۔ اس وقت صرف قلعے کے اوپری حصے کی باقیات اور آثار باآسانی دیکھے جاسکتے ہیں۔ جبکہ مٹی اور پتھروں سے بنے ہوئے اس قلعے کی تعمیر میں لکڑیوں کا بھی استعمال کیا گیا ہے۔ قریب جانے سے قلعے کی چھتوں پر لکڑی بھی نظر آتی ہے۔

قلعے کے احاطے میں تین کنوؤں کے آثار بھی پائے جاتے ہیں جس سے یہ اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ ہزاروں سال قبل یہاں کے لوگ سنگ تراشی اور مٹی سے قلعہ بنانے کے ہنر سے خوب واقف تھے۔ یہ قلعہ مٹی اور پتھروں سے بنایا گیا ہے اور غالب امکان یہی ہے کہ پتھر اور مٹی دریائے کیچ کور سے لیے گئے ہیں، کیونکہ دریائے کیچ 'میری قلات' کے قریب سے گزرتا ہے۔

قلعے کو بیرونی حملہ آوروں سے محفوظ بنانے کے لیے چاروں طرف مورچے قائم کیے گئے تھے اور آثار سے نظر آتا ہے کہ ان مورچوں کے ذریعے قلعے کی حفاظت ہوتی تھی۔ اس قلعے کے چاروں اطراف بنے مورچوں کے نشانات کے آثار اب بھی دیکھے جا سکتے ہیں جبکہ قریب کھجوروں کے باغات ہیں۔ اس قلعے کی کھدائی سے کم و بیش یہاں پر ۲۷۰۰ قبل مسیح سے الگ بھگ سو سال قبل تک مسلسل قبضے کے شواہد سامنے آتے ہیں۔

بارہویں ویں صدی میں اس علاقے میں میر جلال خان ہوت حاکم تھے اور مقامی روایت سے سسی اور پنوں کی داستان سے اس قلعے پر ہوت قبیلہ کی حکمرانی کو تقویت ملتی ہے۔

یونیورسٹی آف بلوچستان سے شعبہ آرکیالوجی کے استاد عمران شبیر نے بتایا کہ اس قلعے میں ۱۲ مختلف ادوار سے لوگ آباد تھے اور یہ ۵۵۰۰ سے ۶۰۰۰ سال پرانا ہے۔ ان کا کہنا تھا کہ کھدائی میں مٹی کی رنگت سے مختلف ثقافتوں کو شناخت کیا جاتا ہے، سب سے قدیم ثقافت قلعے کے نیچے کی مٹی سے شناخت ہوتی ہے اور اوپری مٹی سے آخری ثقافت کو شناخت کیا جاتا ہے اور تحقیق سے پتہ چلا ہے کہ یہاں ۱۲ مختلف بادشاہ اور ثقافتوں کے لوگ رہائش پزیر تھے۔ غالب امکان یہ ہے کہ اس تاریخی قلعے میں مختلف ادوار میں مختلف بادشاہوں اور حکمرانوں کا راج تھا، جن کو اپنے ادوار میں غیر مشروط طاقت حاصل تھی۔ یہ بھی امکان ہے کہ اس سرزمین پر منگول، عرب، یونانی اور غزنوی مختلف ادوار میں حاکم رہے ہیں جبکہ اس حوالے سے کوئی تاریخی دستاویزات موجود نہیں ہیں۔

ماہرین آثار قدیمہ اس بات پر متفق ہیں کہ ہزاروں سال قبل اس قدیم قلعے میں کئی اقوام اور ثقافتوں کے آثار پائے جاتے ہیں۔ بلوچی لوک داستان اور شعری میں موجود

سسی پنوں کے عشقیہ داستان سے اس قلعے کے ماضی کے بارے کے صرف ایک حصے کے بارے میں معلومات ملتی ہے اور باقی ۱۱ ادوار کے حوالے سے تاریخی دستاویزات اب تک غائب ہیں۔

مقامی لوک داستانوں اور شاعری کے مطابق ۱۲ویں صدی میں اس قلعے پر میر جلال خان ہوت حاکم تھے۔ مقامی لوک داستانوں کے مطابق میر دوستین ہوت (پنوں) میر عالی کے بیٹے تھے۔ میر عالی حاکم کیچ میر محمد موت کے صاحبزادے تھے اور یہ میر جلال خان ہوت کے پوتے تھے۔ میر جلال خان ہوت قبیلے کا سربراہ اور حاکم کیچ تھے اور اس قبیلے کے لوگ اب بھی تربت سمیت مکران کے مختلف علاقوں میں رہائش پزیر ہیں۔

مقامی روایت کے مطابق سرزمین کیچ کے حاکم میر عالی کا بیٹے میر دوستین ہوت (پنوں) تجارت کی غرض سے کیچ سے سندھ کے شہر بھنبھور چلے گئے اور سسی کے عاشق ہوئے۔ سسی کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ بھنبھور کے راجا کی بیٹی تھی اور ان کی پیدائش پر جوتشیوں نے راجا کو کہا کہ یہ لڑکی شاہی خاندان کے لیے بدشگونی کی علامت ہے۔ بھنبھور کے راجا نے لڑکی کو ایک لکڑی کے صندوق میں ڈال کر دریائے سندھ کی لہروں کے حوالے کر دیا اور اتفاقاً صندوق بھنبھور کے گاؤں کے ایک بے اولاد دھوبی کے ہاتھ لگا جس نے لڑکی کو خدا کا عطیہ سمجھ کر اپنی اولاد کی طرح پالا۔

کیچ کے حاکم کے بیٹے میر دوستین ہوت کو بھنبھور کے ایک دھوبی کی بیٹی سسی سے عشق ہو گیا اور دھوبی بننے کی شرط پر پنوں سسی سے شادی کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ بتایا جاتا ہے کہ پنوں کا خاندان اس رشتے پر برہم تھا اور پنوں سے ملنے کے بہانے بھنبھور آئے اور نشہ آور مشروبات پلا کر پنوں کو اپنے ساتھ واپس کیچ ساتھ لے گئے۔ جب صبح سسی

خواب سے جاگی تو پنوں کو نہ پا کر دیوانہ ہو کر کیچ کی طرف نکلیں، تپتے صحرا میں پیاس کی شدت سے نڈھال سسی نے ایک چرواہے سے پانی مانگا اور چرواہے کی بدنیتی کو بھانپ کر حسرت بھرے نگاہوں سے آسمان کی طرف دیکھنے لگی اور دعا مانگی۔ اسی اثنا زمین پھٹی اور سسی زمین کے اندر چلی گئیں۔ جب پنوں کو ہوش آیا تو سسی کو نہ پا کر وہ سسی سسی پکارتے ہوئے کیچ سے بھنبھور کی طرف بھاگا اور راستے میں اسی جگہ پر اس کی ملاقات اسی چرواہے سے ہوئی۔ چرواہے نے پنوں کو سارا ماجرا سنایا تو وہ سسی سسی کہہ کر چلایا۔ جواباً سسی کی کرب ناک آواز ابھری، قبر شق ہوئی اور پنوں سسی سے جا ملا۔

محبت کی اس لازوال داستان سسی پنوں کی قبریں بلوچستان کے ضلع لسبیلہ میں موجود ہیں جہاں عقیدت مند زیارت کے لیے آتے جاتے ہیں۔

ایک فرانسیسی ٹیم نے حالیہ برسوں میں اس سائٹ سمیت مکران میں موجود دیگر قلعوں کی کھدائی کی اور کھدائی میں ماہرین کو مختلف ادوار کے آثار ملے، جبکہ اطالوی ماہرین آثار قدیمہ بھی ماضی میں اس قلعے کی کھدائی کرتی رہی ہے۔

ماہرین آثار قدیمہ کے مطابق کھدائی سے پہلے تحفظ اور انتظام کے مربوط اور جامع منصوبہ بندی کے بغیر اس کی کھدائی ممکن نہیں۔ اس قلعے کو دوبارہ اپنی اصلی شکل میں لانا تو ممکن نہیں البتہ جن اشیا سے یہ قلعہ بنایا گیا تھا انہی سے اس جیسا ایک قلعہ بنایا جا سکتا ہے تاکہ قدیم تہذیب اور آثار کو محفوظ کیا جا سکے۔

دو سال قبل حکومت نے اس تاریخی قلعے کو بحال کرنے کے لیے غور شروع کر کے اس حوالے سے منصوبہ بندی کی تھی مگر اس پر تاحال کام شروع نہیں ہو سکا۔ عین ممکن ہے کہ آنے والے بجٹ میں اس کے لیے رقوم مختص کی جائے۔

ماہرین آثار قدیمہ کے مطابق میری قلات کو بحال بنانے کے لیے ضروری ہے کہ اس کو ایک باڑ لگا کر بند کیا جائے اور اس کی مکمل کھدائی کر کے قلعے کے مختلف ادوار کو شناخت کیا جائے

سبی قلعہ (سیوی قلعہ):

یہ عظیم قلعہ سبی کے پُر رونق شہر کے سنگ کسمپری کی تصویر بنا موجود ہے۔ اس کی دیواریں اپنی عظمت رفتہ کی یاد دلاتی ہیں، مگر اس شاہکار کو دیکھنے کم ہی لوگ آتے ہیں۔ آپ اِس ویران اور اجڑے قلعے کی حدود میں داخل ہوں اور شعور کی آنکھیں کھلی رکھیں تو کمروں، راہداریوں اور در و دیوار پر ماضی کے نقوش دیکھ سکتے ہیں۔ جنوب کی طرف مرکزی

دروازے کے آثار موجود ہیں جو بارہ فٹ چوڑا ہے۔ اس کے اوپر دو بڑے برجوں کے نشان ہیں جن میں تیر انداز فروکش ہوتے تھے۔ پہلے برج پر چڑھنے کے لیے قریب ہی سیڑھیاں ہیں۔ وہ ایک دریچے پر ختم ہوتی ہیں۔ اس دریچے سے ملحق ایک گودام میں اناج ڈالا جاتا تھا۔ اس قلعے کی ہر چیز شاندار ہے لیکن اناج کے دو گودام لائق توصیف ہیں۔ پہلے گودام کی لمبائی ۸۰ فٹ اور دوسرے کی ۷۰ فٹ ہے، جبکہ ان کی کشادگی ۳۰ فٹ تھی۔ یہ پختہ اینٹوں سے بنائے گئے۔ نچلے حصے میں ایک دروازہ ہوتا تھا جہاں سے بوقت ضرورت اناج نکالا جاتا۔ آگے ایک اور ویسا ہی برج ہے جس کے دائیں طرف چند سیڑھیاں اوپر جاتی ہیں۔ اس حصے میں نہایت موٹی فصیل واقع ہے۔ یہاں کچھ بوسیدہ کمرے مورچوں سے مشابہت رکھتے ہیں۔ یہ دراصل فوجیوں کی رہائش گاہیں تھیں۔ وہیں سے قلعے کی حفاظت ہوتی‘ حملہ آور لشکر کی نگرانی اور بوقت ضرورت دشمن کے لشکر پر تیر اندازی کی جاتی تھی۔ نیچے نظر دوڑائیں تو سبی کے خوبصورت شہر کا نظارہ کیا جا سکتا ہے۔ قلعے کے وسیع آنگن میں ایک خوبصورت باغ تھا‘ اب وہ بھی اجڑ چکا۔ وہاں خودرو جھاڑیاں، ٹوٹی پھوٹی اینٹوں کے ڈھیر‘ چاروں طرف پھیلی بلند و بالا فصیل اور اس کے ہیبت ناک برج عالم گریہ میں ہیں۔ قلعے کے دوسرے کونے پر بھی ویسا ہی برج واقع ہے۔ اس کے ساتھ کمروں کے آثار ہیں۔ ان کمروں کی دیواریں خوب چوڑی اور دروازے نہایت ہی مضبوط ہیں۔ کمروں کی چھتیں ڈھل چکیں۔ کمروں کی یہ قطار قلعے کے تیسرے کونے تک چلی گئی ہے۔ چاکر کی نجی رہائش گاہ: قلعے کی مغربی فصیل کے اندرونی جانب چاکر کی نجی رہائش گاہ واقع تھی۔ اس کی حفاظت کے لیے دو چھوٹی چوکیاں بنائی گئی تھیں۔ نزدیک ایک تہ خانے کے نشانات بھی ملتے ہیں۔ تہ خانے سے زیر زمین ایک راستہ شمالی چوکی کو جاتا تھا۔ ایک پرانی مسجد کے آثار بھی ہیں جو شہید ہو چکی۔ مسجد کے ساتھ کئی حجروں کے کھنڈر نظر آتے ہیں۔ فصیل کے آخری کونے

میں منہدم دیواریں ایک وسیع اصطبل کی ہیں، جہاں اعلیٰ نسل کے گھوڑے رکھے جاتے تھے۔ فصیل کے ساتھ ساتھ آگے جائیں تو آخری برج پر پہنچ جائیں گے۔ یہ برج دوسرے برجوں کے مقابلے میں قدرے چھوٹا ہے۔ ساتھ ہی سیڑھیاں ہیں۔ ان پر چڑھیں تو فصیل پہ پہنچ جائیں گے۔ فصیل کے ساتھ کئی کمرے نظر آئیں گے۔ بارش اور طوفانوں کی وجہ سے اب یہ اپنی اصل شکل وصورت کھو چکے۔ قلعہ کی فصیل پر چڑھتے جائیں تو دروازے پر پہنچ جائیں گے۔ قلعے کے درمیان چند سیدھی دیواریں منہدم حالت میں ملتی ہیں۔ ہو سکتا ہے اُس زمانے میں ان پر نشانہ بازی کی مشق کی جاتی ہو۔ قلعے کے تینوں جانب فصیل کے نشانات موجود ہیں۔ قدیم زمانے میں فصیل یا دیواریں دفاع کے مقبول ترین انداز تھے۔ قلعہ کی بیرونی فصیل قریباً کئی ایکڑوں پر محیط ہے۔ یہ پرانی چونگی تک چلی گئی ہے۔ یہ چونگی میر چاکر کی بیرونی آمدروفت اور ناکہ (وصولی) کے لیے استعمال ہوتی تھی۔ اس فصیل کے آثار چاکر روڈ کے ساتھ ساتھ تقریباً آدھے کلومیٹر تک اب بھی موجود ہیں۔ یہ فصیل ۸ سے ۱۰ فٹ چوڑی ہے۔ قلعے کی دیواری مٹی مقامی آبادی گھروں کی تعمیر میں استعمال کر چکی۔ قلعہ کی بیرونی چار دیواری کے نشانات بھی مدھم پڑ چکے۔ لیکن ابھی دیکھے جا سکتے ہیں۔ قلعے کے بیرونی جانب چاروں طرف مورچہ نما کمرے بنے ہوئے ہیں۔ ان کمروں میں چھوٹے چھوٹے دریچے (تیر کش) نمایاں نظر آتے ہیں۔ قلعے کے سامنے چھوٹے سے شہر کے بھی آثار نمایاں ہیں۔ وہاں دوران موسم گرما دور دراز علاقوں سے کثیر تعداد میں قبائل کی آمد کی وجہ سے قلعہ کے باہر میدان میں خیموں کا شہر آباد ہو جاتا تھا۔ لوگوں کی مختلف ضروریات پوری کرنے کے واسطے منڈی میں خوجوں کی بڑی بڑی دکانیں کھل جاتی جن میں ہرات کا مخمل اور عطر، تبریز کے عجائبات، دمشق و قاہرہ کے اسلحے موجود ہوتے۔ ان دکانداروں نے سبی کے قریہ قریہ میں اپنے کارندے متعین کر رکھے تھے۔ وہ سرداروں اور

معززین کی مانگ پر سبی آ کر انھیں چیزیں فراہم کرتے۔ اسی میدان کے ایک حصے میں اعلیٰ نسل کے مواشی کی وسیع منڈی لگتی۔ دوسرے حصے میں اہم ترین میلے کا انعقاد ہوتا۔ واضح رہے کہ رندو لاشار قبائل کی تیس سالہ جنگ کا موجب بھی یہی میلا بنا تھا جس میں چاکر کے بیٹے' ریحان اور گہرام کے بیٹے' رامین نے گھڑ دوڑ میں حصہ لیا۔ اس میں جیت و ہار پر تنازع پیدا ہوا جو بعد میں بلوچ حاکمیت کا شیرازہ بکھیرنے کا سبب بن گیا۔ جب بلوچستان انگریزوں کی عمل داری میں آیا' تو انھیں یہ میلا بہت بھایا۔ چناں چہ انھوں نے اس کے انعقاد کی خاطر بڑے میدان اور خصوصی عمارات مثلاً جرگہ ہال، گورنر ہائوس، سرکٹ ہائوس وغیرہ تعمیر کرائیں۔ یہ میلا آج بھی روایتی شان سے منایا جاتا ہے۔ چند سال قبل تک ہر سال میلے کا افتتاح صدر مملکت فرمایا کرتے تھے۔ اس موقع پر سبی کی ترقی کے لیے خاطر خواہ رقوم کا اعلان ہوتا۔ لیکن بانی میلا کے قلعے کی بحالی کے لیے نہ کسی نے اعلان کیا اور نہ ہی کہیں سے مطالبہ ہوا۔ ہاں سردار اختر مینگل نے اپنے دور وزارت اعلیٰ میں اس کی مرمت کا اعلان کیا تھا۔ اس سلسلے میں ان کے مشیر ملک طوقی نے کچھ کوششیں بھی کیں' لیکن ان کا منصوبہ عملی جامہ نہیں پہن سکا۔ قلعے کے آثار کا نظارہ آدمی کو جھنجھوڑ کر رکھ دیتا ہے۔ حرم خانے، دیوان خانے، قید خانے، اسلحہ خانے وغیرہ یہ سب عہد ماضی کی یادگاریں ہیں۔ انھیں دیکھ کر احساس ہوتا ہے کہ ہر شے زبان خموشی سے کہہ رہی ہے: ”دنیا کی ہر چیز فانی ہے۔ صرف ذات باری تعالیٰ فنا سے ماورا ہے۔“ آج کل یہ قلعہ مختلف جانوروں کی آماج گاہ بنا ہوا ہے۔ قلعے کے اندر خودرو پودے بڑی تعداد میں اگ آئے ہیں۔ اس وجہ سے سانپ، زہریلے کیڑے مکوڑے اور دوسرے بے شمار حشرات اِن میں پائے جاتے ہیں۔ خوفناک کُتے ہر وقت قلعے کے آس پاس اور اندر منہ کھولے دندناتے پھرتے ہیں۔ قلعے کے قریب سبی چھائونی واقع ہے جہاں تعمیر و ترقی کے نئے باب دکھائی دیتے اور صفائی کا نادر نمونہ بھی نظر

آتا ہے۔ ہر طرف خوبصورت عمارتیں، سڑکیں اور تفریحی مقامات بنائے گئے ہیں۔ لیکن اس تاریخی قلعے کی حالت اب بھی افسوس ناک ہے۔ مختلف علاقوں کے لوگ یہاں خزانے کی تلاش میں دیواریں گرا کر اور زمین وغیرہ کھود کر قلعے کی حالت مزید خراب کر کے چلے جاتے ہیں اور انھیں کوئی پوچھنے والا نہیں۔ یہ قلعہ اپنے قیام سے مختلف طوفانوں کا سامنا کرتا چلا آ رہا ہے۔ کبھی یہ قبائلی جھگڑوں اور کبھی بیرونی حملہ آوروں کا شکار رہا۔ پھر صدیوں تک اسے نظر انداز کر دیا گیا اور اس کی دیکھ بھال اور مرمت پہ کوئی توجہ نہیں دی گئی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ قلعہ تقریباً منہدم ہو گیا۔ جو قومیں اپنے ماضی کے ورثے کی حفاظت نہیں کر سکیں‘ وہ کبھی کامیاب نہیں ہوئیں۔ یہ اشد ضروری ہے کہ حکومت قلعہ کے خستہ حال حصوں کی از سر نو تعمیر و مرمت کی جانب توجہ دے۔ ایک ماہر آرکیٹیکٹ کے ذریعے اس کی بحالی کا کام کرائے۔ یوں یہ قلعہ سیاحوں کے لیے پُرکشش اور قابل دید تفریحی مقام بن سکتا ہے

مصادر و مراجع

1. Abu Fazal, Ain-e-Akbari, Vol: I., ed. Blochmann, Calcutta, 1867. Also see 1877-78 editions
2. Akbarnama, Vol. II; Bib. Indica, Calcutta, 1873.
3. Akbarnama, Vol. III. Tr. H. Beveridge, 1939; Book Traders, Lahore (Re-print), 1973.
4. Abu Ishaq Ibrahim ibn Muhammad al-Farsi, al-Istakhri, Al-Masalik Wal-Mamalik, E. J. Brill, Leyden, 1923.
5. Ackermann, H.C, Narrative Stone Reliefs from Gandhara in Victoria & Albert Museum, London, 1975.
6. Agha, Mahdi Hasan, Tughlaq Dynasty, New Delhi (Re-print), 1936.
7. Ahmed, Khawja Nizamuddin, Tabqat-e-Akbari, Vol. I, Asiatic Society, Calcutta (Re-print), 1973.
8. Aif, Shams Siraj, Tarikh-e-Feroz Shahi Bib. Indica, Calcutta (ed. Wilyat Hussain), 1891.
9. Aitken, E.H., Gazetteer of the Province of Sind, Karachi, 1907.
10. Akhtar, M. Saleem, Sind Under the Mughals (an introduction to, translation of & commentary on the Mazhar-i-Shah Jahani of Yusuf Mirak), Islamabad, 1990.
11. Al-Baladhuri, Futuh-ul-Buldan (Arabic), Beirut, 1978.
12. Ali Kufi bin Hamid bin Abi Bakar, Fath Namah-i-Sind, ed. N.A. Baloch, Islamabad, 1983.
13. Al-Maqdisi, Ahsan-al-Taqasim fi Marifat al-Aqalim, E. J. Brill, Leyden, 1906.
14. Amir Ali, A Short History of the Saracens, 2nd Re-Print, Karachi, 1988.
15. Ansari, Ishtiaq, Sindh Ja Kot Ain Qila (Sindhi), Karachi, 1996.
16. Archaeological Survey of India Report, 1932, Delhi Fort.
17. Aziz, Mahmudul, The Jats in Iraq in Sindhological Studies, (Summer), Institute of Sindhology, University of Sind, Jamshoro, 1981.
18. Babur, Zaheeruddin, Babarnama, Vol: I & II (tr. Annette S. Beveridge), Sang-e-Meel Publications, Lahore, 1975.

19. Badayuni, Abdul Qadir, Muntakhab-ul-Tawarikh Adarah-i-Adabiyat-i-Delh, Vol. II (Tr. W. H. Lowe), Vol. III (T. Wolsely Haig), 1973.
20. Bakhari, Mir Muhammad Masum, Tarikh-e-Masumi (Urdu tr. Akhtar Rizvi), Sindhi Adabi Board, Hyderabad, 1959.
21. Balkhi, Mahmud bin Amir Wali, Bahar Al Asrar Fi Marfat Al-Akhyar, Vol. I, Part-II, Pakistan Historical Society, Karachi, 1996.
22. Baloch, N.A. (ed.), Fathnama-i-Sind, Institute of History Culture and Civilization, Islamabad, 1983
23. Sindh, Studies in History, Vol. I, Kalhora Seminar Committee, Karachi, 1996.
24. Barni, Ziauddin, Tarikh-e-Firoz Shahi, Calcutta, 1862. A Concise Edition, Lahore, 1972.
25. Qadeem Sindh (Sindhi), Jamshoro, 1992.
26. Bell, Evans, Annexation of the Punjab, (Re-Print), Lahore, 1975.
27. Bhatti, Rasheed, “Mid Stream Fortress” in Sindhological Studies (Summer), Institute of Sindhology, Jamshoro, 1985.
28. Billimoria, N.M., “Some Ancient Tribes of Sapta Sindhu” in Journal of Sindh Historical Society, Vol. VII/1-2, July, 1944.
29. Boehringer, Erich, “Alexander The Great” in 5000 Years of Art in Pakistan, 1962.
30. Bokhari, S. Hakim Ali Shah, “Akbar's Birth Place at Umerkot” in Journal of Pakistan Archaeological Forum, Vol. I, Issue I., Karachi, 1992.
31. Brice, Martin, Forts and Fortresses, New York, 1990.
32. Brown, Percy, Indian Architecture (Buddhist and Hindu Periods), Bombay, 1965.
33. Burton Richard, Sind Revisited, Vol. I & II, Deptt: of Culture and Tourism, Govt. of Sindh, Karachi, 1993.
34. Archaeological Survey of India-Report on a Tour in the Punjab, 1878-79 (Vol. XIV), Calcutta, 1882.
35. Cambridge Ancient History, Vol. IV, VI and XII.
36. Cambridge History of India, Vol. I, (Re-Print), Cambridge 1922.
37. Cambridge Mediaeval History, Vol. I.

38. Report of the Archacological Survey of India, Vol. II Calcutta, 1882.
39. Report of the Archaeological Survey of India; Vol. V., 1872-73.
40. Dani, A.H., "Fort Marot Bahawalnagar Inscription dated Saka, 1732 (1790 A.D)" in Journal of Asian Civilizations, Vol. XXIV, No. 2, Dec:2001, Islamabad, 2001.
41. "Lahore, the oldest living city in Pakistan" in Journal of Asian Civilizations, Vol. XXII, No. 1, July 1999, Islamabad, 1999.
42. "Thatta, Islamic Architecture & Central Asia in Journal of Central Asia, Vol. IX, No. 1, July 1986, Islamabad, 1986.
43. "Thatta", Islamic Architecture, Islamabad, 1982.
44. District Gazetteer, Multan (1901-02), Lahore, 1902.
45. District Gazetteer, Peshawar (New). District Gazetteer, Rawalpindi, Lahore, 1909.
46. District Gazetteer, Zhob, Quetta, 1986.
47. Encyclopaedia of Britannica, Vol. 7.
48. Encyclopaedia of Britannica, Vol. II (11th Edition).
49. Epigraphia, Indo-Moslemica, Calcutta, 1923-24.
50. Exhibition of Gandhara Art of Pakistan, Osaka (Japan), 1984.
51. Farooq, A.A., "Sodhra" in Sodhra Gazetteer, No. 9, Sodhra, Distt. Gujranwala, 1990.
52. "Tse-Kia: The Ancient Capital of Punjab" in Journal of Pakistan Historical Society, Karachi, Vol. XXXVI, Part IV, Oct. 1988.
53. Faruqi, Khurshid Ahmed, Islami Dunya Dasavin Sadi Isvi Men (Urdu), Delhi, 1962.
54. Faruqi, Lois Lamya al, Islam and Art, National Hijra Council, Islamabad, 1985.
55. Hasan, Shaikh Khurshid, "An Indus Seal Depicting an Anthropomorphic Scene" in Journal of Central Asia, Vol. XIII, No.2, December 1990, Quaid-e-Azam University, Islamabad, 1990.
56. "Cultural Heritage of Pakistan" in Journal of Pakistan Historical Society, Vol. XLV, Oct. 1997, Part-IV, Karachi, 1997.
57. "To Be or Not To Be" in Dawn, Magazine Section, 4th May, 1990.

58. Chaukhandi Tombs in Pakistan, Royal Book Co., Karachi, 1996.
59. The Islamic Architectural Heritage of Pakistan (Funerary Memorial Architecture), Royal Book Co., Karachi, 2001.
60. The Historics (Revised by A. R. Burn), 1964.
61. Hillenbrand, Robert, "Mughal Architecture Explored" in South Asian Studies, Vol. 12, New Delhi, 1996.
62. Islamic Architecture, Edinburgh University Press, 1994.
63. Huges, A.W., Gazetteer of the Province of Sind, London, 1874.
64. Hughes, Richard, Baltit Fort Conservation, (UNESCO), 1986 & 1995.
65. Husaini, S.A.Q., Administration Under the Mughals, Dacca, 1952.
66. Ibrahim, Asma, "Recent Archeaological Discoveries in Indus Delta" in Archaeological Review, Vol:2, Issue I & II, Karachi, 1993.
67. "The Monograms: An Exciting Discovery at Tharro Hill Fortress" in Archaeological Review, Vol. 8-10, Karachi, 2001.
68. Ingholt, Herald, Gandharan Art in Pakistan, New York, 1957.
Irvine, W., The Army of Indian Mughals, London, 1903.
69. Jafar, S.M., Peshawar: Past & Present, Peshawar, 1945.
70. Jairazbhoy, R.A., An Outline of Islamic Architecture, Bombay, 1972.
71. Art & Cities of Islam, Bombay, 1964.
72. Jehangir, Noor-uddin, Tuzuk-e-Jehangir, Vol. I (tr. Alexander Rodgers) & Vol. II (ed. Henry Beveridge), Sange-e Meel Publications, Lahore, 1974.
73. Jehangirnama of Muhammad Hadi, Tr, edited and annotated by Wheeler H. Thackston, 1999.
74. Jilani, Mushtaq, "Archaeology of Weapons in South East Asia" in Proceedings of Third South Asian Archaeological Congress, Deptt. of Archaeology, Govt. of Pakistan, Karachi, 1988.
75. Kausar, Inamul Haq, "Historical Fort of Balochistan Quetta Miri" in Proceedings of the Hijra Celebration Symposium on Islamic Art etc., Vol. III, University of Peshawar, 1981.
76. Kazim, Mohammad, Alamgir Nama, Calcutta, 1868.

77. Kenoyer, Jonathan Mark, Ancient Cities of the Indus Valley Civilization, Oxford University Press, Karachi, 1998.
78. Khan, Ansar Zahid, History & Culture of Sindh, Royal Book Co. Karachi, 1980.
79. Khan, F.A., “Kot Diji Culture” in Indus Civilization, New Perspective, Islamabad, 1981.
80. Banbhore, 4th Edition, Department of Archaeology, Govt. of Pakistan, Karachi, 1976.
81. Khan, Hashmatullah, “Padum Party ek naqabil-i-faramosh dastan” in Karakorum Hindkush, 1969.
82. Mukhtasar Tarikh-i-Jammun, Part IV, (Re-Print), Lahore, 1985.
83. Khan, Husain, “Mughal Relations with Baltistan & Northern Region from Akbar to Aurangzeb” in Journal of Central Asia, Vol. VII, No.1, July 1984, Islamabad, 1984.
84. Khan, Inayat, Shah Jehan Nama, (ed. W. E. Begley & Z.A. Desai), Delhi, 1990.
85. Kufi, Ali Ibn Hamid al, Chachnama, ed. Dr. Daudpauta, Delhi, 1939.
86. Kumboh, Muhammad Saleh, Amal-e-Saleh, Vol. II, Calcutta, 1928.
87. Lahori, Abdul Hamid, Badshahnama, Bib. Indica, Vol. I & II, Calcuttta, 1866-72.
88. Lakho, Ghulam Mohammad, “Umarkot: Chand Tarikhi Masla” in Mehran, 1986-2, Jamshoro, 1986.
89. Lundkhawar, Ali Muhammad, “Mughal Hammams in the City of Lahore” in Pakistan Archaeology No. 10-22, Deptt. of Archaeology, Govt. of Pakistan, Karachi, 1986.
90. M’Crindle, J. W., Ancient India, as Described in Classical Literature, Westminster, 1901.
91. Invasion of India by Alexander the Great, 1893.
92. Mackey, E. J. H., Further Excavations at Mohenjodaro, Vol. I, New Delhi, 1938.
93. The Buddisht Art of Gandhara, Second Edition, Karachi, 1973.
94. Maulana Minhajuddin Abu Umar-i-Usman, Tabkat-e-Nasri, Vol. I, Royal Asiatic Society of Bengal, Calcutta, 1881 (tr. Major G. Raverty).

95. Mysteries of the Ancient World (n.d.), National Geographic Society, Washington, D.C. Nadiem, I. H., "Rohtas: The formidable Fort of Sher Shah Suri" in Journal of Central Asia, Vol. VII, No. 2, Dec. 1984, Islamabad, 1984.
96. Nath, R., History of Mughal Architecture, Vol. I, New Delhi, 1982.
97. History of Mughal Architecture, Vol. II (Akbar), New Delhi, 1985.
98. Nazim, M., Mahmud of Ghazna, Lahore, 1931, Re-print, 1973.
99. Nematullah, History of Afghans (tr. Benhard Dorn J. Murrary Albemarle), London, 1829.
100. New Archaeological Finds in China (II), Foreign Languages Press, Peking, 1978.
101. Nizamuddin Ahmad, Tabqat-e-Akbari, Vol. II. Bib. Indica, 1931. Re-print, Asiatic Society, 1973.
102. Noor-uddin Mohammad Jehangir, Tuzuk-e-Jehangiri, Vol. I & II (tr. A. Rodgers, ed. H. Beveridge), Sange-e-Meel Publications, Lahore, 1974.
103. Oriental College Magazine, Lahore, 1938.
104. Pakistan Archaeology, No. 1, Deptt. of Archaeology, Govt. of Pakistan, Karachi, 1964.
105. Pakistan Archaeology, No. 10-22, Deptt. of Archeology, Govt. of Pakistan, Karachi, 1986.
106. Pakistan Archaeology, No. 2, Deptt. of Archaeology, Govt. of Pakistan, Karachi, 1965.
107. Pakistan Archaeology, No. 27, Deptt. of Archaeology, Govt. of Pakistan, Karachi, 1992.
108. Pakistan Archaeology, No. 4, Deptt. of Archaeology, Govt. of Pakistan, Karachi, 1967.
109. Pakistan Archaeology, No. 5, Deptt. of Archaeology, Govt. of Pakistan, Karachi, 1968.
110. Pakistan Heritage Society Newsletter No. 1, January 1998, Peshawar.
111. Pakistan Historical Society Journal, No. XXXVIII, Oct. 1990, Part IV, Karachi.
112. Panhwar, M.H., (1981), Ranikot Fort: Its Odd location, 1981.

113. Chronological Dictionary of Sind, Insititute of Sindhology, University of Sindh, Jamshoro, 1983.
114. Pathan, Mumtaz Hussain, Sind (Arab Period), Sindhi Adabi Board, Hyderabad, 1978.
115. Tuhfat al Kiram (ed. Pir Husamuddin Rashidi), Sindhi Adabi Board, Hyderabad, 1971.
116. Qaisar, Ahsan Jan, Building Construction in Mughal India, Oxford University Press, Delhi, 1988.
117. Quddusi, Aijazul Haq, Tarikh-e-Sind, Vol. I, (Urdu), (Second Edition), Karachi, 1976.
118. Qudrutullah, (Brig.), Tarikhi-i-Ahd Atiq, Riasat-i-Hunza, Vol. I, (Re-print), 1962.
119. Qureshi, I. H., The Administration of Sultans of Delhi, 4th Edition, Karachi, 1958.
120. Historical Dissertation, Pakistan Historical Society, Karachi, 1962.
121. Rasul, Mehar Ghulam, Tarikh-e-Kalhora, Part I & II, Sindhi Adabi Board, Hyderabad, 1958.
122. Rehman, Abdul, Historic Towns of Punjab (Ancient & Medieval (Period), Lahore, 1977.
123. Rehman, Abdur, The Last Two dynasties of Sahis, Islamabad, 1965.
124. Riazul Islam, Indo-Persian Relations, Tehran, 1979.
125. Sabir, Muhammad Shafi, Story of Khyber, Peshawar, 1966.
126. Salam, Sultana, “Architecture of Sheikhupura Fort” in Historic Perspective, South Asian Studies, No. 5, 1989, London, 1989.
127. Sami, Ali, Persepolis, Shiraz, 1986.
128. Sarkar, Jadunath, Military History of India, Calcutta, 1960.
129. Sarwani, Abbas Khan, “Tarikh-e-Sher Shahi” in the History of India as told by its own Historians, Elliot & Dowson, Vol. IV, Delhi, 1914.
130. Scerrato Umberto, “Excavations at Raja Gira, Swat, A Preliminary Report” in Pakistan Archaeology, No. 10-22, Department of Archaeology, Govt. of Pakistan, Karachi, 1986.
131. Siddiqi, M. H., History of the Arghuns & Tarkhans of Sindh, Insititute of Sindhology, Jamshoro, 1972.

132. Siraj, Minhaj al din, Tabqat-e-Nasri, (Urdu tr. Ghulam Rasul Mehar), Lahore, 1985.
133. Sirhindi, Yahya bin Ahmed, Tarikh-e-Mubarak Shahi (Urdu), (tr. Dr. Aftab Asghar), Lahore, 1976.
134. Bibliography 145 Smith, E. W., "Akbar's Tomb", Archaeological Survey of India Annual Report, XXXV, 1909, Allahabad, 1909.
135. Smith, Vincent, The early History of India, Oxford (Re-print), 1914.
136. Spices, Otto, Masalik-ul-Absar, Aligarh (n.d). Spooner, D.B., Archaeological Survey of India Annual Report 1921-22, Kafirkot (Northern), Plate, XXVI, Simla, 1924.
137. Stein, Aurel, "An archaeological tour in Gedrosia", Memoir of Archl. Survey of India, No. 43, Calcutta, 1932.
138. Report on Archaeological Survey, N.W.F.P., 1905.
139. Tod, James, Annals & Antiquities of Rajasthan, Vol. II, London, 1920.
140. Toy, Sidney, A History of Fortifications, (Second Edition), London, 1966.
141. The Fortified Cities of India, London, 1965. Vogel, J. Ph, Tile-Mosaic of Lahore Fort, 1920.
142. Wakiyat-e-Jehangiri, (Re-print), Lahore, 1975.